فہرست

انشائیے کی حمایت میں

پروفیسر ڈاکٹر سید زوار حسین شاہ

ڈاکٹر زوار حسین کا انشائیہ

شمیم حیدر ترمذی

انشائیہ کی نئی جہت علی تنہا

1۔ نیند

2۔ چوری

3 ۔ شہرت گزیدہ

4 ۔ قینچی

5 ۔ شیطان سے مذاکرات

6 ۔ جھگڑا

7 ۔ کتا اور گدھا

8 ۔ خواب اور خواہشیں

9 ۔ بغلول

10 ۔ حواس باختہ ہونا

11 ۔ کتے

12 ۔ حقہ بردار

13 ۔ مسکرانا

14 ۔ شور اور شعور

15 ۔ بھلائی کے خواب

16۔ تعزیت نامہ

انشائیے کی حمایت میں

انشائیے میں موضوع، مفہوم اور اسلوب سمیت کچھ بھی روایتی نہیں ہوتا۔ انشائیہ نگار عموماً" انشائیے کے لیے وہ موضوع منتخب کرتا ہے جسے وہ علامت بنا سکے۔ چونکہ انشائیہ کا سارا حسن اس کی پیشکش میں ہوتا ہے۔ اس لیے انشائیہ نگار اپنے اسلوب اور انداز بیاں کے ذریعے معمولی کو غیر معمولی اور غیر اہم کو اہم بنا دیتا ہے۔ انشائیہ نگار افسانوی ادب یا فکشن کی طرح واقعات بیان نہیں کرتا، مضمون نگار یا مقالہ نگار کی طرح منطقی انداز نہیں اپناتا۔ کرداروں کے ذریعے سماجی اونچ نیچ کو بیان نہیں کرتا۔ بلکہ تاریخ اور تہذیب کے ہر دور سے دانش کشید کرتا ہے تاکہ فکر انسانی کو ان راستوں کی سیر کرائے؛ جو معلوم نہیں کب سے انسانی دانش کی راہ تک رہے ہیں۔ قاری جب انشائیہ نگار کے دکھائے ہوئے راستے پر قدم سے قدم ملا کر معنی و مفاہیم کی نئی دنیا سے متعارف ہوتا ہے تو سرشاری کی جس منزل سے انشائیہ نگار گزرا تھا وہی سرشاری انشائیے کے قاری کے تجربے میں بھی شامل ہو کر قاری کے فکر و ذہن کے دریچوں کو روشنی عطا کرتی ہے۔ پہلو بدل بدل کر پھر پہلی بات پر آجانا انشائیے کی پیشکش کے لیے بنیادی شرط ہے۔ جس طرح گہرے پانیوں کی ندی میں بھنور پیدا ہوتے ہیں مگر پانی کی دائروی حرکت کے باوجود بھی ندی کا سفر جاری رہتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ اپنے موضوع کو مس کرتے ہوئے دائرے بناتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ صنف انشائیہ کا یہ وصف ہی نہیں تقاضا بھی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے عہد کا محض عکاس نہیں ہوتا بلکہ پوری تاریخ انسانی کا ہشت چشم پارکھ ہوتا ہے۔ تاریخ کے ہر عہد اور تہذیب کے ہر موڑ سے واقفیت کے سبب سے انشائیہ نگار اپنے موضوع کو علامت بنا کر مسلسل اپنی ذات کے پردے میں تاریخ و تہذیب کی پرتیں ایک ایک کر کے کھولتا چلا جاتا ہے؛ جنہیں صدیوں سے زمانے کی گرد نے ڈھانپ رکھا ہے۔

انشائیہ نگار کا اسلوب، خیال کی جدت اور خرد افروزی کی روشن سمیت سب کچھ ذاتی ہوتا ہے۔ کسی دوسرے شاعر، ادیب یا تخلیق کار کے خیال کا تجزیہ، تشریح یا توضیح انشائیہ نگار کے منصب کو زیبا نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انشائیے میں مزاحیہ اور طنزیہ جملے لائے جا سکتے ہیں مگر انشائیہ کی بنیاد طنز یا مزاح پر نہیں رکھی جا سکتی۔ انشائیہ قصہ گوئی یا لطیفہ گوئی نہیں بلکہ انشائیہ گہری فکر کی حامل پر معنز تحریر ہوتی ہے۔ جس کا ہر جملہ فلسفے اور دانش کے در وا کرتا ہے۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ انشائیہ نگار کے لفظوں کے طلسم کو عبور کر کے انشائیہ نگار کی روح اور ذات میں چھپے کرب آگہی تک رسائی حاصل کرتا ہے یا پھر الفاظ کی بھول بھلیوں میں خود کو گم کر لیتا ہے۔

غزل اور انشائیہ اردو ادب کی دو ایسی اصناف ہیں جنہیں تحسین و تردید کے لیے کم و بیش ایک جیسے حالات کا سامنا رہا ہے۔ غزل شاید ہر شاعر کہہ سکتا ہے مگر معیاری غزل ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اسی طرح انشائیہ تخلیق کرنے کی خواہش بھی شاید ہر نثر نگار کی ہو مگر صنف انشائیہ کا رمز آشنا ہونا چیزے دیگر است۔ مگر ایک فرق کے ساتھ کہ ہر نو آموز غزل کو تختہ مشق بنا سکتا ہے مگر ہر نو آموز نثر نگار انشائیہ کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتا۔ اس لیے کہ انشائیہ پختہ ذہنوں کی جولاں گاہ ہے۔ جس طرح غزل کو مملکت ادب سے نکال باہر کرنے کی کوششیں شدت سے ہوئیں اس سے کہیں زیادہ شدت سے غزل کے ہم نواؤں اور خود غزل کی جمالیاتی قوت نے غزل کے مخالفین کو پسپائی پر مجبور کیا۔ اسی طرح انشائیہ کی گردن زنی کے اعلان بھی بار بار ہوئے مگر انشائیہ کی ستہ داری اور معنویت، اچھوتے خیالات و تصورات، انداز بیاں کی رعنائی اور شگفتگی نے ہر بار مخالفین کے ہوش و حواس کو مختل کیا۔ چنانچہ اردو انشائیہ آج بھی پوری تاب و توانائی کے ساتھ اپنے قارئین سے ہم کلام ہے۔

جہاں تک میرے انشائیوں کا تعلق ہے میری انشائیے اس ادراک و آگہی سے جنم لیتے ہیں جو عظیم انسانی قدروں کے افلاس کا شاہد بھی ہے اور ناقد بھی۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب جب زرخیز ذہنوں نے تاریخ کے اوراق کو پلٹا اور تہذیب کی گرہیں کھولنا چاہیں تو انہوں نے تاریخ کے ہر فیصلہ کن موڑ پر علم و عافیت، صدق و صفا اور عدل و وفا کا پرچم بلند کرنے والوں کے مقابلے میں جہالت و جفا، کذب و ریا اور

ظلم و دغا کے نیزے بلند دیکھے۔ الٰہی اور ابلیسیت کے راج اور رواج نے ہر عہد کے محترم انسانوں کا ناطقہ بند رکھا اور ان کے پاکیزہ نقوش مٹائے۔ تاریخ میں کم ہی ایسے ادوار دیکھنے کو ملیں گے جب انسانوں نے زمین کے اجلے پانیوں کو لہو رنگ نہ کیا ہو۔ ہر عہد میں آدمیت کو فاشیت اور سفاکیت کا سامنا رہا ہے۔ گزشتہ کل کی طرح آج بھی ہر شے لخت لخت ہے۔ دوسروں کو معتوب خود کو محبوب دیکھنے اور دکھانے کی خواہش نے ہمیں اور ہمارے اعمال کو پر فریب بنا دیا ہے۔ بغیر کسی اکتساب فیض کے، نیکیاں اور اچھائیاں ہم اپنی جھولی میں ڈالنا چاہتے ہیں اور گناہ و گمراہی دوسروں کے کھاتے میں ڈال کر خوش ہوتے ہیں۔ ہر فرد معاشرے میں فتنہ و فساد کی نیت باندھے کھڑا ہے۔ ہر نیک عمل کی ٹوہ لگائیں تو نیکی کی کوکھ سے ہماری بد نیتی اور خود غرضی کی بھڑیں بھنبھناتی ہوئی نکلیں گی۔ مصنوعی نیکوکاروں کے اس جتھے اور چھتے کو اگر کوئی چھیڑنے کی کوشش کرے یا چھوڑنے کی کوشش کرے، ہر دو صورتوں میں اس کی کیا، کسی کی بھی خیر نہیں۔

بھیڑ کی کھال میں چھپے ہوئے بھیڑیے، معاشرے کی ہر مکرم قدر کو روندتے اور نیست و نابود کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اخلاقی قدروں نے سفاک منتروں کا روپ دھار لیا ہے۔ معاشرتی قدریں، مساویاتی مساکیت کے سوا کچھ نہیں رہیں۔ معیشت اور مذہب نے منفعت کا چوراہا اور چبوترا بنا کر ہر کمزور پر نگاہ غیظ و غضب گاڑ دی ہے۔ روحانیت روح سے خالی اور جسم کے لاابالی پن کے سوا کچھ نہیں۔ روایات اور رواداری کو تعصب و تعفن کی چتا دکھا دی گئی ہے۔ اہل درد کے لبوں سے اوراد کی سوغات، مکارانہ پھوار کا روپ دھار چکی۔ شرف و شرافت کے معیارات یا تو مٹ گئے ہیں یا مٹا دیے گئے ہیں۔ علم و عمل کی قوت بس اتنی رہ گئی ہے کہ اتفاق سے ابتدا اور نفاق پر اختتام ہوتا ہے۔

ساقی گری تو عام ہے مگر ساغر، عقل سوز ہونے کے سبب بدنام ہے۔ جسے دیکھو، مال مفت کا چسکا ہے یا لپکا ہے۔ کمینے، کینے سے لبریز سینے لیے، ہر گلی بازار، شہر شہر گھوم رہے ہیں۔ ہاتھوں میں سیلفی کی تلوار، طینت میں نسبی پھٹکار، کہیں فتوے اگل رہے ہیں کہیں جلوے جل دے رہے ہیں۔ کہیں مسند پر مسلط لوگ کلیاں مسل رہے ہیں۔ کہیں ہوس پرور، دندان آز تیز کیے، شکم و شرم گاہ کی آگ کے لیے اگ بگولا ہوئے پھرتے ہیں۔ انسان، حیوان اور حیات سبھی یہ طرفہ منظر دیکھ کر حیراں ہیں۔ عرشِ خدائے ذوالجلال اور زمین و آسمان پر سکوت ہی سکوت ہے اس پر مستزاد کارکنان قضا و قدر بھی خاموش ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے بولہبی کی کائنات ہو، جہاں زہر ہی نبات ہو؛ جہاں درد ہی سوغات ہو؛ جہاں سوچنا جرم ہو اور فریاد فسق ہو، جہاں امن مفقود اور ظلم مشروع ہو؛ ظالم مسعود اور مظلوم مطیع و مجروح ہو، جھوٹ ہر دم جواں اور سچ مسلسل نوحہ خواں ہو؛ جہاں معلومات کے سیلاب نے دانائی کی ہر فصل اجاڑ دی ہو؛ جہاں زبان کو ابلاغ کا ذریعہ نہ رہنے دیا گیا ہو بلکہ شور مچانے کا آلہ بنا دیا گیا ہو۔ ایسے میں میرا انشائیہ تاریخی شعور اور تہذیبی تنوع کی امانت سنبھالے ہوئے اس اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتا ہے کہ راقم نے اپنی کوئی بات منوانے کے لیے انشائیہ نہیں لکھا بلکہ امکانات کے در وا کرنے کی شعوری کوشش کی ہے جو دائرہ ادراک میں لکھتے سمے موجود تھے۔ اس لیے میرا ہر انشائیہ کہیں بیدار کرتا ہے، تو کہیں آشنائے راز کرتا ہے، کہیں ذات و صفات کا پردہ ہے، تو کہیں بات ہی در پردہ ہے اور یہ خفی و جلی معنوی پرتیں قاری کو مختلف اوقات میں قرات کے مرحلے پر مختلف کیفیتوں سے آشنا کریں گی۔

پروفیسر ڈاکٹر سید زوار حسین شاہ

ڈاکٹر زوار حسین کا انشائیہ

تحریر: شمیم حیدر ترمذی

میں نہیں (Definition) پروفیسر زوار حسین کی تحریریں مجھے اس لیے اچھی لگیں کہ لکھتے وقت انہوں نے خود کو انشائیہ کی تعریف اُلجھایا۔ موصوف نے "پیش لفظ" میں ایک بات کہی کہ "انشائیے کا سارا حسن اس کی پیش کش میں ہوتا ہے" اور پھر انشائیے پر متحارب گروہوں کے معرکوں اور بحثوں سے بے نیاز ہو کر سولہ انشائیے لکھ ڈالے۔ یوں ان کی کتاب پر کچھ لکھنا، میرے لئے آسان تر ہو گیا اور میں نے انشائیہ، حُسن اور پیش کش، تین لفظوں کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر صاحب کی انشائیہ نگاری پر صرف تین باتیں اختصار کے ساتھ لکھ دیں۔

مصنف نے واقعی اپنے انشائیے کو حسین بنانے کے لیے اس کی پیش کش کو خوبصورت بنایا۔ اس کے لئے انہوں نے سب سے پہلے نثری جسم کو شعری قبا سے مزیّن کیا۔ یہ قبا جسم پر اس قدر راست آئی کہ نثر حسین ہو گئی۔ نتیجہ یہ کہ انشائیہ حسین تر نظر آنے لگا۔ آپ ان انشائیوں میں نثر اور شعر کی آمیزش سے پیدا ہونے والی دل آویز تحریر کا لطف اٹھائیں گے۔ پھر یہ کیفیت فطری انداز میں پیدا ہوئی ہے۔ آورد نہیں، آمد لگتی ہے۔ پیش کش کی یہ خوبصورتی اس لیے ہمارے سامنے آئی کہ مصنف نثر اور نظم دونوں کی صورت اور مزاج سے بخوبی آگاہ ہے۔ اسی لیے قاری کو اس کتاب کے بہت سے نثری ٹکڑے، نظم کے مصرعے لگیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس فنی کاوش نے انشائیوں کے حُسن اور اثر کو دُونا کر دیا ہے۔

مسکراہٹ فسوں ہے، قہقہہ جوش جنوں ہے۔ مسکراہٹ ٹھہرا ہوا پانی ہے، قہقہہ دریا کی روانی ہے۔ مسکراہٹ میں طنز کی زہرناکی ہوتی ہے، "
"قہقہے میں لہجے کی بے باکی ہوتی ہے۔ مسکراہٹ کلاسیکی شاعری ہے اور قہقہہ آزاد نظم۔

(مسکرانا)

شہرت کا دَر جتنی تیزی سے کُھلتا ہے، اسی تیزی سے بند ہو جاتا ہے کیونکہ شہرت بے وفا اور بے ردا ہوتی ہے اور عظمت باوفا اور باحیا"
"ہوتی ہے۔ عظمت دین و دیانت کا گھر ہوتی ہے اور شہرت عموماً" بے ثمر ہوتی ہے۔

(شہرت گزیدہ)

خوابوں کا منصب عکس بنانا، نقش بنانا، سرشار کرنا اور مست کر دینا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خواہشیں سراب دکھاتی ہیں، سراب "
"کے لیے دوڑاتی ہیں۔ اپنے اسیر کو تھکا کر نحیف و نزار کر دیتی ہیں۔

(خواب اور خواہشیں)

دوسری بات یہ کہ مصنف نے انشائیے کی پیش کش کو مؤثر بنانے کے لیے تقابل اور موازنے کو وسیلہ بنایا ہے۔ وہ جب چیزوں اور کیفیتوں کو تقابل اور موازنے کے عمل سے گزارتا ہے تو تحریر میں منطقی استدلال اور عالمانہ رسوخ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حال میں قاری بھی مصنف کی سرخوشی اور سرشاری میں شریک ہو جاتا ہے۔ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ علم و دانش اور فلسفہ و منطق کے ایسے منطقے میں داخل ہو گیا ہے جہاں اسے ذہن اور روح دونوں کی بالیدگی کا سامان میسّر ہے۔ نثر کے یہ ٹکڑے قاری کو ایسی دانش گاہ میں لے جاتے ہیں جہاں ذہنوں کی تصعید اور روح کی تطہیر کا تدریسی عمل ہمہ وقت جاری و ساری رہتا ہے۔

شور اگر خارج میں ہوتا ہے تو ہمیں واقعات، سانحات اور حادثات کی خبر دیتا ہے اور یہی شور اگر ہماری ذات میں داخل ہو" جائے تو شعور میں ڈھل جاتا ہے۔ شور، شعور میں ڈھل کر ہماری ذات میں متلاطم رہتا ہے۔ یہی متلاطم موجیں اظہار کے لیے راستے تلاش کرتی ہیں۔ اسی من کی موج کا نام فن ہے۔"(شور اور شعور)

نیند اور نحوست جہاں رین بسیرا کر لیں، وہاں سے بیداری اور بخت کوچ کر جاتے ہیں۔۔۔۔ نیند اور بے داری مختلف مزاجوں کے مہمان" ہیں۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی ان کے تعلقات میں نہایت کشیدہ ہوتے ہیں، کسی روایتی ساس اور بہو کی طرح۔ نیند کو گھر کی بہو اور بیداری کو ساس کہہ دیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔"(نیند)

ہر جھگڑے کے پس پردہ انا کی آگ ہوتی ہے۔ آگ کا یہ الاؤ مسلسل بھڑکتا رہتا ہے نہ انا کی آگ بجھتی ہے، نہ جھگڑے ختم ہوتے" ہیں۔

(جھگڑا)

"ہمارا ہر خواب، خواہش کے لیے پردے کا کام کرتا ہے۔ ہم جب تک خواہش کو خواب کا لباس نہ پہنا لیں، خود کو اسیر آرزو سمجھتے ہیں۔"

(بھلائی کے خواب)

لوگ احمق کو تو معاف کر سکتے ہیں اور اس سے ہمدردانہ برتاؤ کا بھی سوچ سکتے ہیں مگر کسی بغلول کو مناسب یا نامناسب رعایت" دینے کو تیار نہیں۔ الٹا محفل میں ایک سجے سجائے بغلول کی ہمہ وقت تلاش رہتی ہے۔

(بغلول)

خُفّہ بردار کے ہاتھ میں توہین و توصیف کی دو دھاری تلوار، کبھی حق کی گردن پر پڑتی ہے تو کبھی باطل کو بھنبھوڑتی ہے تاکہ داد و دہش کا سلسلہ رکنے نہ" پائے۔(خُفّہ بردار)

انشائیہ کے ارتقائی سفر کے آغاز میں انشائیہ نگاروں کے ہاں ایک رجحان غالب رہا، وہ تھا عام سے موضوع کو خاص بنا کر پیش کرنا، معمولی شے کو ارتفاع دے کر غیر معمولی بنا دینا اور کسی ادنیٰ خیال کو نچلی سطح سے اٹھا کر اعلیٰ تصور یا تصویر میں تبدیل کر دینا۔ ایک ادبی گروہ تو اس رجحان کو انشائیہ کی بنیادی صفت قرار دیتا تھا۔ ڈاکٹر زوار حسین کے انشائیوں میں بھی اس رجحان کی جھلک دیکھنے کو ضرور ملتی ہے لیکن انہوں نے کُلّی طور پر اس اختیار نہیں کیا۔ ہاں چند انشائیوں میں اس ٹیکنیک کو ضرور برتا ہے۔ انہوں نے بھی کچھ تحریروں میں کر کے علامت کا روپ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے بھی رفعتِ خیال اور قوتِ متخیلّہ کہ جوہر دکھاتے Elevate عام موضوع کو ہوئے کم اہم چیز یا خیال کو زیادہ اہم بنانے اور ہمیں دکھانے کا تخلیقی تجربہ کیا ہے۔ 'قینچی'، 'کُتّے'، 'کتا اور گدھا'، 'چوری'، جھگڑا ظاہر ہے کہ عام موضوعات ہیں جنہیں مصنف نے ایسا ٹریٹمنٹ دیا ہے کہ یہ اپنی سطح سے بلند ہو کر علامتی، فلسفیانہ اور عالمانہ روح اختیار کر گئے ہیں۔

یورپین دانشوروں نے تاریک دور سے قوم کو نکالنے کا واحد حل کتا شناسی میں دریافت کیا۔ جسے دیکھو، فخر سے سینہ پھُلائے، گردن اٹھائے، کتا" بغل میں دبائے یا سینے سے چمٹائے، سڑکوں، پارکوں، سکولوں میں بیٹھے ہیں۔ حتّٰی کہ سیمیناروں میں بھی کتوں کے بغیر شرکت نہیں کرتے۔"

(کتے)

اوّل اوّل تو ہم قینچی سے جیب تراشی کا کام لیتے رہے مگر آخر کار ہم نے جنم جنم کے سُود وزیاں کے سودے قینچی کے سپرد کر دئے۔ یہاں تک کہ " ہمارا ادب، تہذیب اور تنقید تک قینچی مار کہ کے نام سے مشہور ہے۔" (قینچی)

سب اتفاق کریں گے کہ قیمتی جہیز کے ساتھ دلہن کو ایک عدد کُتّا بھی دیا جائے یا پھر لڑکے والے جہیز کے ساتھ کتا بھی ضرور طلب کریں" تا کہ دلہن اجنبیت کا شکار نہ ہو۔ گدھا دلہن کے آگے آگے اور کتا پیچھے پیچھے ہوگا۔ دلہن کو منہ دکھائی میں نقدی نہیں دی جائے گی بلکہ کتے کے پِلّے سلامی میں دیے جائیں گے"۔ (کتا اور گدھا)

سچ تو یہ ہے کہ چور کا کوئی اقدام تہذیب و تواضع کے خلاف نہیں ہوتا تھا۔ مہذب اس قدر کے کسی کو جاگتے میں نقصان" "پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ دن کو کسی کے لُٹنے کا امکان ہی نہ تھا۔ وہ چوری کو عبادت اور ریاضت سمجھ کر کرتا تھا۔

(چوری)

جھگڑا ہی انسان کی واحد میراث ہے جو ہر قوم کو مِن و عَن اور صحیح و سالم حالت میں پہنچی ہے ورنہ یہاں تو ہر چیز کا حُلیہ اور" حالت بگڑی ہوئی ملتی ہے۔ صرف جھگڑا اور فتنہ و فساد ہی خالص رہ گئے ہیں ان میں خیانت کا شبہ کم از کم ہے۔"۔ (جھگڑا)

میں اس کتاب کو لفظ لفظ پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ڈاکٹر زوار حسین عالم ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ انہوں نے کیا لکھا" ہے اور کیا لکھا ہے؟ وہ مفکر ہیں کیونکہ اس کتاب کے ہر صفحے پر "فکر ریزے "ضوفشاں ہیں۔ وہ اچھے نثر نگار ہیں کیونکہ ان کی نثر قاری کی نظر، ذہن اور دل کو برابر اپنی طرف کھینچتی ہے۔ وہ کامیاب انشائیہ نگار ہیں کیونکہ ان کے انشائیوں کا اسلوب اور مواد ذاتی ہے، دوسروں کی خوشہ چینی کا نتیجہ نہیں۔ مجھے وہ ایسے تخلیق کار لگتے ہیں جو کسی بھی صنف ادب پر تہذیبی رچاؤ کے ساتھ طبع آزمائی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اللہ پروفیسر صاحب کو توفیق دے کہ وہ علم و ادب کے میدان میں اسی شد و مد سے تخلیقی اور تحقیقی کام کرتے رہیں۔ ہم سب ان کی کامیابی کے لیے دل سے دعا کرتے ہیں، اس یقین کے ساتھ کہ "شہر علم "اور "باب علم" کے آگے جھولی پھیلانے والا طالب علم کبھی تہی دامن نہیں رہتا۔

نیند

نیند سے کسی بندہ بشر کو مفر نہیں، آپ حسب معمول دفتر سے بھاگ سکتے ہیں، کتابوں کو ہاتھ لگانا ترک کر سکتے ہیں۔ ملائے مسجد کو سات سلام کر سکتے ہیں۔ (اگرچہ آسان نہیں) رات کا کھانا اور دن کا ظہرانہ حکم حاکم پر چھوڑ سکتے ہیں، بھاگتے چور کی لنگوٹی کو کھینچ سکتے ہیں۔ مگر نیند سے بیزاری کا اظہار نہیں کر سکتے نیند سے اگر آپ نے دوستی کر لی ہے تو سفر ہو یا حضر، دفتر ہو یا گھر، خلوت ہو یا جلوت، نیند آپ کے جلو میں ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ مگر اسے گاڑی کے چلنے اور دماغ کے چل بچل ہونے سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ آپ لاکھ چاہیں کہ نیند سے چھٹکارا ملے، مگر امکان کے در انکھوں کی طرح بند ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر نیند سے نفرت کیسی؟ کہ یہ بیکاری کا بہترین مشغلہ ہے اور مشغلہ بھی ایسا کہ جس میں جان و مال کی قربانی نہیں دینا پڑتی۔ محنت درکار نہیں، سوچنا نہیں پڑتا اور عمل بھی نہیں کرنا پڑتا۔ ادب سے دلچسپی کے لیے کلاسیک کیا، کچھ بھی نہیں پڑھنا پڑتا۔ مذہب سے لو نہیں لگانا پڑتی، دوستوں کو اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نیند اور بندہ تنہائی میں ہی راز و نیاز کی باتیں کر لیتے ہیں۔ دشمنوں سے بچاؤ کے منصوبے نہیں بنائے جاتے۔ یعنی یہ نیند ہی ہے جو دین و دنیا کے معاملات سے آزاد کرتی ہے۔ نیند کوئی خطرناک قسم کا مشغلہ نہیں جس میں ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا پڑے۔ قلعے تعمیر نہیں کرنا پڑتے، حتیٰ کہ ہوائی قلعوں کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ نیند ہے کہ بندے کو فکر و فقر سے آزادی عطا کرتی ہے۔ کچھ صرف نہیں کرنا پڑتا، سوائے وقت کے۔ اور وقت ہر امیر غریب کے پاس یکساں ہے۔ جو نہ علم کی طرح حاصل کرنا پڑتا ہے اور نہ رزق کی طرح کمانا پڑتا ہے۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ اس کہاوت میں اتنی سی ترمیم کی ضرورت ہے کہ نیند آتی ہی سولی پر ہے۔ بلکہ ابدی و ازلی نیند کے ذائقوں سے تو سولی پر چڑھنے والا ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نیند سے پیار کرنے والے ابدی نیند سے دور بھاگتے ہیں اور بھاگتا وہی ہے جس کے پاس مقابلے کی قوت نہ ہو۔ مگر ایسے شکست خوردہ کا نیند تعاقب جاری رکھتی ہے اور جب بھی موقع ملتا ہے دبوچ لیتی ہے، کسی آسان اور کمزور شکار کی طرح۔ یوں تو عمومی زندگی میں نیند اور نحوست کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ نیند آتی ہے تو نحوست اس کے ہم رکاب ہوتی ہے یا کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ نحوست پہلے آتی ہے اور نیند بن بلائے مہمان کی طرح بعد میں آتی ہے۔ اور بن بلایا مہمان، آپ تو جانتے ہی ہیں، نہ آتا آپ کی مرضی سے ہے اور نہ جاتا آپ کی مرضی سے ہے۔ نیند اور نحوست جہاں رین بسیرا کر لیں، وہاں سے بیداری اور بخت کوچ کر جاتے ہیں۔ جس طرح تیسری دنیا کے غریب ممالک سے اہل علم اور ہنرمند افراد یورپ اور امریکہ سفر کر جاتے ہیں۔

نیند اور بیداری دو مختلف مزاجوں کے مہمان ہیں ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ان کے تعلقات نہایت کشیدہ ہوتے ہیں کسی روایتی ساس اور بہو کی طرح۔ نیند کو گھر کی بہو اور بیداری کو ساس کہہ دیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ ساس سمجھتی ہے کہ بہو گھر میں معزز مہمان یا مالک مکان بن کر نہ رہے بلکہ خادم بن کر رہے۔ مگر بہو ہے کہ ساس کی ایک نہیں سنتی۔ یہی حال نیند کا ہے کہ عادت سے مجبور ہو کر گھر کی مالک بن بیٹھتی ہے۔ عادات پر قبضہ، اعصاب پر قبضہ، دماغ پر قبضہ، دن پر قبضہ، رات پر قبضہ؛ غرض یہ کہ نیند بندے کو بے بس کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس بیداری کو دیکھو ساری صفات معزز و محترم مہمان کی طرح رکھتی ہے کہ ذرا میزبان نے التفات میں کمی کی، ذرا میزبان کے ماتھے پر بل آیا، ذرا یہ دیکھا کہ

میزبان کاہلی اور سستی کا شکار ہو رہا ہے، بیداری نے کوچ کا اعلان کر دیا۔ نیند کی طرح قابض اور غاصب کا روپ ہر گز نہیں دھارتی۔ نیند ہے کہ میزبان کا سارا کاروبار ہی اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ آپ لاکھ کوشش کریں نیند سے نجات ملے مگر کیا مجال نیند آپ کو آزادی کا سانس لینے دے۔ آپ بیوی اور برہمن سے معذرت کر سکتے ہیں، مگر نیند سے ہر گز نہیں۔

نیند باطل کی طرح حق کا لباس پہن لیتی ہے۔ شعور کو شرارت کا نام دیتی ہے۔ اپنے شکار کو تھپکتی ہے، لوری دیتی ہے کہ سوتے رہو، کہ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ نیند کے ماتوں کے لبوں پر مُہرِ سکوت لگا دیتی ہے۔ اس کا شکار کوئی قوم ہو یا کوئی فرد واحد، خوابِ خرگوش کے مزے لیتے رہتے ہیں۔ مگر جیسے ہی کوئی اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوا، معاشی طور پر بدحال ہوا، ذہنی طور پر مفلوج ہوا؛ نیند کسے پرلے درجے کے خوشامدی اور چاپلوس کی طرح غائب ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کو حکماء نے نیند اڑنے سے تعبیر کیا ہے۔ نیند جب اپنے ماتے کی ساری قوتیں سلب کر لیتی ہے تو کسی بھرے پرے گھر کا رخ کرتی ہے، کسی مغربی سرمایہ کار یا سفارت کار کی طرح۔ مغربی سفارت کار یا سرمایہ کار بھی عجیب ہوتے ہیں، جس ملک یا قوم کا رخ کرتے ہیں، وہاں کے ہوش مند طبقے کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ اور جن کی نیندیں حرام ہو جائیں دنیا کا کوئی مذہب یا مذہبی پیشوا انہیں حلال قرار نہیں دے سکتا۔ کیونکہ حلال کو حرام قرار دینے کی ہر کوشش اور خواہش حرام ہوتی ہے، چاہے حرم کعبہ کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔

نیند کو معمولی اوزار یا اعزاز نہ سمجھنا۔ یہ پل بھر میں غریب سے غریب آدمی کے لیے بھی عیش و عشرت کے سارے سامان مہیا کر دیتی ہے۔ آسمانوں کی سیر، زمین کی تسخیر، انواع و اقسام کے میوہ جات، جدید ساز و سامان سے آراستہ و پیراستہ گھر، تابع فرمان غلام و خدام، لچکتی مٹکتی لونڈیاں، حسینوں کا جھرمٹ، اس جھرمٹ میں آپ یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں سے ممکن نہیں۔ نیند یہ سب کچھ آپ کا کوئی پائی پیسہ خرچ کیے بغیر دیتی ہے۔ سوائے خدا کے کوئی اتنی بڑی عنایت کا روادار نہیں ہو سکتا۔ نیند ہی نیند میں آپ دنیا کے سارے کھیل، کھیل سکتے ہیں۔ بہت سے کھیلوں سے تو آپ متعارف ہی نیند کے ذریعے ہوتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے پسپائی، رقیبوں کی رسوائی، ہاکی، کرکٹ، جمناسٹک سمیت تمام گفتہ اور ناگفتہ بہ کھیلوں اور کھلاڑیوں سے ہماری آشنائی کا منظر نامہ صرف نیند کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ نیند ہی ہے جو طالب علم سے کتاب چھین کر اس پر آرام و آسودگی کے در وا کرتی ہے۔ اپنی اپنی سوچ اور اپنی اپنی فکر کے مصداق کوئی نیند کو تنہائی اور رسوائی کا ساتھی کہتا ہے تو کوئی اسے بلائے بے درماں کے لقب سے نوازتا ہے۔ نیند کے ستائے ہوئے کے رُوداد سنو تو کہتا ہے: "یاوری قسمت سے صدر محفل بنا، مگر نیند کی دیوی کو منظور نہ تھا۔ نیند کی دیوی کا نزول ہوا میں نے سر کو جھٹکے دیے۔ ڈراؤنے خیالات و تصورات کو ذہن میں جگہ دی۔ تصور ہی تصور میں دیکھا کہ سانپ میرے بالکل قریب آ گیا ہے مگر آنکھیں نہ کھلی پھر سوچا چلو شیش ناگ یا مقامی پولیس انسپیکٹر کا خیال ذہن میں لاؤں مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں نے خود کو ہلکے ہلکے چپت لگائے؛ دوسروں کی نظر بچا کے، اپنے بال نوچے، پھر میں نے سوچا سیکرٹری پر غلط تلفظ کی پاداش میں اچانک انڈوں کی بارش ہونے لگی ہے یا پھر یہ کہ میرا لاڈلا بیٹا کنویں میں گر گیا ہے_ ہمائے کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، ہڈی پسلی ایک ہو گئی ہے_ میری لاٹری نکل آئی ہے آزاد نظم اور نثری نظم لکھنے پر دنیا بھر میں پابندی لگا دی گئی ہے۔ میرے دشمنوں پر آگ اور مجھ پر ہن برسنا شروع ہو گیا ہے۔ پہاڑوں نے اپنے خزانے اگل دیے ہیں۔ عوام نے بھی اہل محفل کی طرح مجھے اپنا صدر منتخب کر لیا ہے یہ اور اس جیسے تصورات میری نیند کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ پھر واقعات کو یوں ذہن میں لایا: ہائے اللہ توبہ! اس نے

بندر یا کو کتنا نچپایا کہ ہلکان ہو گئی صرف روٹی کے واسطے۔ غریب کے ساتھ یہ ناروا سلوک، ارے بندریا اور بندہ کس قدر چیخ رہے تھے۔ مگر بندر یا کو ناچنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ بندے کو ذرا بھی تو ترس نہیں آ رہا تھا حیوانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ فیض جیسے عظیم شاعر کو ابھی سے ہی بھلا دیا ہے، غزل و نظم کا یکساں بڑا شاعر ہے۔ مگر غالب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ فیض کو غالب پر فوقیت دینے کا کوئی جواز نہیں اقبال بھی تو کچھ کم نہیں خواہ مخواہ مغرب زدہ طبقہ انہیں رگید تا ہے۔ مگر سب حربے ناکام ہوئے اور میں ناکام صدر ثابت ہوا۔

اس سے پہلے کہ نیند کی دیوی کا نزول ہو اور میں بھی میٹھی نیند سو جاؤں یا پھر کوئی بندۂ خدا میری نیند چرانے یا نیت میں خلل ڈالنے کی کوشش کرے کہ ہر عمل کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری نیت اور اپنے ذہنی صحت پر شبہ نہ کریں گے۔ میں آپ کو نیند اور نیت کے حوالے کرتا ہوں۔

چوری

چوری اس فعل یا فساد کا نام ہے جس کا نظارہ کوئی اور کرے یا نہ کرے چشم فلک اس کا نظارہ ضرور کرتی ہے۔ ورنہ ہر آنکھ کچھ نہ کچھ وقت کے لیے ضرور بند ہو جاتی ہے یا آنکھ بند کر لی جاتی ہے۔ اور کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سارا فعل فساد اسی آنکھ کے بند کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ممکن ہے آپ کو اس سے اتفاق نہ ہو یا اتفاق نہ ہوا ہو۔ یا پھر یہ کہ سب کچھ اتفاق سے ممکن ہوا ہو۔ آنکھ بند کر لینا بھی عجیب گُل کھلاتا ہے، ادھر آنکھ بند ہوئی ادھر تاریخ کا پہیہ الٹا گھومنا شروع ہوا۔ اور تاریخ کا پہیہ ہمیں اس مقام پر لے آیا جہاں سے انسان نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ واقفان حال کا خیال ہے کہ انسان نے یہ سفر چاہت اور چوری سے شروع کیا تھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ چوری انسان کا سب سے قدیم فن اور پیشہ ہے۔ داد دینا چاہیے انسان کے ذوق تجسس اور قوت اختراع کی کہ چوری کا فن نہ کسی سے سیکھا، نہ کسی کو چوری کرتے دیکھا۔ بس چپکے سے چوری چھپے پھل کھا لیا یا پھل کو ہاتھ لگا لیا۔ ورنہ اسے تو معمولی سے معمولی کام کے لیے بھی استاد اور ٹریننگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر ٹریننگ کے تو اسے کوئی مکھی مارنا یا مچھر مار بھی تسلیم نہیں کرتا۔ چاہے کتنے مچھر مار چکا ہو اور مکھیاں مارنے کی ڈیوٹی ہی کیوں نہ انجام دے رہا ہو۔ اس سب کے لیے ڈپلومہ، ڈپلومہ کے لیے تجربہ گاہ اور تجربہ گاہ کے لیے مکھیوں اور مچھروں کی بہتات، ضروری ہے۔ جس کے اہتمام میں مغربی ممالک اب تک ناکام چلے آ رہے ہیں۔ مطلوبہ تعداد کا پورا نہ ہونا ان کے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے۔ خیر بات چوری کی ہو رہی تھی وہ دن اور آج کا دن، انسان کہیں بھی پکا ہوا پھل دیکھتا ہے، للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے، کوئی پھول دیکھتا ہے تو خاموشی سے اچک لیتا ہے۔ چپکے سے، سب سے نظریں چرا کر۔

بات چوری چھپے پھل کھانے تک رہتی تو شاید معاملات، معمولات پر رہتے۔ مگر یہاں تو کایا ہی پلٹ گئی۔ تمام قوائے جسم و ذہن نے بغاوت کا اعلان کر دیا اور بغاوت جب ایک مرتبہ پھوٹ پڑے تو اس کی بیخ کنی ناممکن ہو جاتی ہے۔ بغاوت کے شعلے اچانک اور بار بار بھڑک اٹھتے ہیں جتنی دیر میں ان شعلوں کو بجھانے کا بندوبست ہوتا ہے، بہت کچھ جل کر راکھ ہو جاتا ہے ۔سچ کہا گیا ہے کہ لوٹ مچی دیکھ کر تو شرفاء بھی لوٹ مار میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہی ہوا جس کا خیال تک نہ تھا۔ دیکھا تو ہاتھ پاؤں چور، لب و دہن چور، ہاتھ چوری کے لیے مستعد ہوئے تو آنکھیں چرائی جانے لگیں۔ یہاں تک کہ خیال و دماغ تک میں چور گھس آئے۔ خیال نے خیال چرا لیا۔ دل نے دماغ چرا لیا، دماغ نے اعصاب چرا لیے، اعصاب نے ہاتھ پاؤں باندھ کر رکھ دیے، ہاتھوں نے پاؤں کی نہ چلنے دی، پاؤں نے اگر چلنے میں جلدی کی۔ اس آپا دھاپی میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور ایک وجود میں کئی وجود آن موجود ہوئے۔ خود آپ کو اور مجھے بھی خبر نہیں ہو پا رہی کہ آخر چور ہے کون اور کہاں چھپ گیا ہے۔

دنیا میں کوئی فن اور پیشہ ایسا نہیں جس میں تگ و دو اور تردد نہ کرنا پڑے۔ مثلاً "ڈاکہ زنی، راہ زنی، وکالت، سیاست، موسیقی، خطابت، اور کتابت سمیت کون سا فن اور پیشہ ایسا ہے جس کے لیے مسلسل ریاض اور ریہرسل کی ضرورت نہ پڑے۔ آپ ڈاکہ زنی ہی کو لیجیے، اس سے میری یہ ہرگز مراد نہیں کہ آپ اس پیشے ہی کو اپنا لیں۔ اور اگر آپ پہلے ہی اس پیشے سے وابستہ ہیں یا وابستہ ہونے کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں تو مجھے دخل در معمولات کی عادت نہیں۔ ڈاکے پڑتے، بندے مرتے، گھر لٹتے اور گردن میں پھندے پڑتے تو سب نے دیکھے ہوں گے مگر کون ہے جو کسی کی دیکھا دیکھی سینہ تان کر قانون یا قاتل کے سامنے

آجائے۔ البتہ وکالت کی بات اور ہے۔ قانون تو کیا قاتل قانون کے سامنے بھی وکالت سینہ سپر ہونے سے باز نہیں آتی۔ مگر وکالت اور چوری میں نہ تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی رشتہ عارضی ہے نہ دائمی۔ بلکہ دونوں میں بعد بہیمانہ ہے۔ دونوں کا مقابلہ یا موازنہ بھی خبط اور خطرے سے خالی نہیں۔ کہاں چور کا بُھک مُوا ہونا، کہاں وکیل کا اپنے شکار پر جھپٹنا، کہاں چور کی کس مپرسی، کہاں وکیل کی دیدہ دلیری، کہاں چور کی خاموشی، کہاں کی وکیل کی سرگوشی، کہاں چور کا اپنی علت وعادت کو چھپائے چھپائے پھرنا، کہاں وکیل کا ہر مقصد کے لیے قانون کے سائے سائے چلنا۔ چور زیادہ سے زیادہ چوری، چستی اور چالاکی کی مثلث بنا سکتا ہے، اس کے برعکس وکیل کو دیکھو: جرم، مجرم، قانون اور قیاس کی مستطیل سے مربع پر مربع بنا سکتا ہے۔ یہ فن راتوں رات اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ اس کے لیے اسے دن کو رات اور رات کو تابناک کرنا پڑتا ہے۔ کہاں آسان طلب چور جو ہمیشہ رات اور رعایت کا طلب گار رہتا ہے لہذا کامیابی وکیل کے قدم چومتی ہے۔

ہاں یاد آیا ہے کہ وکیل اکیسویں صدی کی وہ واحد مخلوق ہے جو اپنے اعمال، امثال اور خیال کے اعتبار سے ہر ذی حیات مخلوق سے مختلف و منفرد ہوتی ہے۔ مثلاً" وکیل جھوٹا نہیں ہوتا، قاتل نہیں ہوتا، نہ قانون کا، نہ کسی ناکام نظریے کا، نہ ہی کسی اور شے کا۔ سست، کاہل اور نااہل نہیں ہوتا، اگر کہیں ایسے پایائے جاتے ہوں ہمارے علم میں نہیں۔ وہ وعدہ خلاف، خائن اور دھوکہ باز نہیں ہوتا۔ رشوت کے پیسوں کو نہ تو خود ہاتھ لگاتا ہے نہ ہی کسی کو ہاتھ لگانے دیتا ہے۔ شرابی، جواری اور فاسق نہیں ہوتا۔ وکیل کو غصہ نہیں آتا۔ اس کی اولاد، قریبی رشتہ دار اور ہم جولی تک ان برائیوں سے بری ہوتے ہیں یا بری اور تہی قرار دیے جاتے ہیں۔ وکیل فحش بات اور فحش حرکت نہیں کرتا۔ اخلاقی اور ذہنی پستی کا شکار ہو کر قاتل کا ہمدرد نہیں ہو سکتا۔ میلے چیکٹ کپڑے نہیں پہنتا، جن سے بدبو برآمد ہوتی ہو، وکیل برآمد ہو تو کوئی بات نہیں۔ حتی کہ وکیل کے پیدل چلنے سے زمین پر بوجھ کم پڑتا ہے اگر وہ موٹر کار پر سفر کرے تو عوام الناس کا رستہ نہیں رکتا۔ اول تو وہ بنک سے قرض لیتا ہی نہیں اور بالفرض قرض لے لے تو بغیر حیل وحجت کے واپس کرتا ہے۔ مسجد میں جاتا ہے تو صفیں پھلانگتا ہوا پہلی صف میں جا بیٹھنے کی سعی نہیں کرتا۔ اور تو اور جھوٹی گواہی کے لیے اپنے موکل کو بیانات نہیں رٹواتا۔ قومی املاک کو نقصان نہیں پہنچاتا اور عدالتی نظام میں خلل انداز نہیں ہوتا آپ کہیں گے چور اور چوری کا ان باتوں اور بیانیے سے تعلق؟ تو عرض ہے کہ چور اس طرح کے خواب نہیں دیکھتا جو ہمیں سوجھتے ہیں۔ جہاں تک وکیل کا تعلق ہے وہ تحریف لفظی اور قلیل بخشی سے دور اور وقوعہ سے قریب رہتا ہے۔

خیر اس بحث کو چھوڑ کر اصل موضوع چور اور چوری کی طرف آتے ہیں۔ تاکہیں چور اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہمارا خیال اور آپ کی توجہ ہی نہ چرا لے۔ جب ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ چوری ابن آدم کا اولین اور قدیم ترین پیشہ ہے تو یہ مان لینے میں کیا حرج ہے کہ چوری ہماری عادت ہی نہیں ضرورت بھی ہے۔ چوری ضرورت نہ ہوتی تو آج ہم سب چور دروازے تلاش نہ کر رہے ہوتے۔ ضرورت ہر ایجاد اور عادت کی ماں ہے۔ ہر پیشہ پہلے پہل ضرورت ہی کے سبب سے وجود میں آتا ہے۔ بعد میں فن اور فخر میں ڈھلتا ہے اور آخر میں پھوہڑپن کا شکار ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر جب بھی اور جہاں بھی بوالہوس، حسن پرستی شعار کرے گا تو عشق آسودگی کا لباس پہن لے گا۔ نتیجہ بوالہوس اور عشق کی رسوائی کی صورت میں برآمد ہوگا۔ اس مثال کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب دریا میں طغیانی ہو تو کشتی میں سوار ہونا ضرورت ہے۔ منجدھار میں ڈوبنا مقدر ہے اور پار اترنا فخر

کی بات ہے۔ مگر کشتی میں سوار ہو کر اٹھکیلیاں کرنا، کبھی دائیں کبھی بائیں، کبھی آگے کبھی پیچھے ہو ہو جانا یا کبھی بغیر پانی اور طغیانی کے ہاتھوں کے کرتب دکھانا اور ہاتھوں ہی سے خالی چپو چلانا فن کی دلیل ہے۔ ہاں اگر کوئی صبح و شام کشتی میں ہی پڑا رہے تو یہ پھوہڑپن کی دلیل ہے۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ جب کسی مرض کی علامات مریض کے علاوہ سب کو دکھائی دینے لگیں تو سمجھ لیجیے مریض لا علاج اور مرض لادوا ہو چکا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کتنی ہی حسینائیں ضرورتاً" داشتائیں بنیں مگر جو فن میں تاک تھیں ملکہ عالم کہلائیں اور کتنی ہی ملکہ عالم پھوہڑپن سے طاق نسیاں ہو گئیں۔

بہت ہی پرانی بات ہے جب چور اپنے پیشے سے پیار کرتا تھا اور چوری کو عبادت اور چالاکی کو ریاضت کا منصب حاصل نہیں ہوا تھا۔ چوری پیشہ چاہے کسی بھی منصب پر فائز ہوتا وہ کسی گھر کے نظام کو تہ و بالا نہیں کرتا تھا اور نہ ہی بندر کی سزا چور کو اور چور کی سزا شوہر کو ملتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ بہت سے لوگ اس پیشے اور فن سے وابستہ ہو گئے۔ بہت سوں نے تو شہرت کے پروں پر پرواز بھی کی۔ کچھ پیشہ وروں نے تو چوری چھپے چوری کے دامن میں ہی پناہ لے لی اور خاندان کے خاندان اور قبیلے چور بن بیٹھے۔ مگر آج سب ویسا نہیں اج پورا سماج اور پوری تہذیب یا تو چور ہے یا چوری ہو گئی ہے۔ ورنہ چور تو قتل ناحق کی مانند صرف سنائی دیتا تھا، دکھائی کہیں نہیں دیتا تھا۔

آج جب بہت سے بدنام اور نیک نام پیشے زمانے کی دست درازی کے ہاتھوں یک جان و یک ایمان ہو گئے ہیں تو چور کی ساری قابلیت اور قبولیت کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ چور کو اپنی ساکھ اور شناخت کی فکر لاحق ہے۔ آباء اور آبائی پیشہ کے عزیز نہیں ہوتا۔ چناں چہ چور کو اپنا زاویہ ءنگاہ اور طریقہ ترقی بدلنے کے لیے اپنا چولا اور چال چلن بدلنا پڑا ہے۔ کیونکہ پیشہ ور چور کو ہر قبیل اور قماش کے لوگ برا بھلا کہنے لگے ہیں۔ دشنام طرازی عام ہو چکی ہے۔ حد یہ کہ ہر طرح کے ظلم وزیادتی کرنے والوں مثلاً" کم تولنے والوں، رشوت کا مال کھانے والوں، منافع خوروں اور ذخیرہ اندوزوں سمیت ہر طرح کی معاشرتی برائیوں میں ملوث مجرموں کو چور کہا جانے لگا ہے۔ اس پر مستزاد ان سب طرح کے مجرموں کو کالی بھیڑوں سے تشبیہ دی جا رہی ہے۔ چور چاہے بھی تو ہتک عزت کا دعوی نہیں کر سکتا کہ چور کے دل میں بھی چور ہے۔ مگر کالی بھیڑ سے مماثلت نے تو اس کی حیثیت و حمیّت کو ادھ مُوا کر کے رکھ دیا ہے۔ اسے اپنے فن اور فریب پر جو ناز تھا نہیں رہا۔ ایک سبب تو یہ کہ بھیڑ جیسے معصوم جانور کا ان جرائم سے کوئی خاص تعلق نہیں بنتا۔ بھیڑ کی جگہ بھیڑیا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ کسی کو صرف بھیڑیا کالی بھیڑ کہہ دینے سے جرات اور جرم کا وہ تصور ابھرتا ہی نہیں، جس پر چور نازاں اور مست رہتا تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ زمانہ سنہ رہا جب شومئی قسمت سے کہیں کوئی چور پکڑا جاتا تو پہلے اس کا منہ کالا کیا جاتا۔ پھر اسے گدھے پر سوار کر کے قصبے کا چکر لگوایا جاتا ،تب کہیں چور کو شہرت اور ہجوم کو تسکین ملتی تھی۔ چور گدھے کی پیٹھ پر مطمئن بیٹھا پورے گاؤں کا جائزہ لیتا جاتا اور اہل و نااہل مجمع یعنی چھوٹے بڑے، سب گدھے کے آگے ناچتے جاتے۔ جیسے کوئی تہوار منایا جا رہا ہو۔ اب تو ویسا کچھ بھی نہیں دکھتا چوروں کے گلے میں جوتوں کے ہار تک نہیں ڈالے جاتے یا تو جوتے کم پڑ گئے ہیں یا پھر چوروں کی بہتات نے عوام الناس سے تفریح طبع کا یہ سامان بھی چھین لیا ہے۔ اگرچہ چوروں کی بہتات سے وسائل اور مال مسروقہ کی تقسیم میں بے قاعدگی اور بد دیانتی کے امکانات میں اضافہ ہوا ہے مگر ہم نے اس فن کی بدولت کئی نئے فن متعارف بھی کرائے ہیں جن کا تعلق، چور اور چوری سے بنتا ہے۔ ماہرین سرقہ نے تو کفن چوری اور سرقہ بالجبر کا موجد بھی ہمیں ہی قرار دیا ہے مگر حق یہ ہے کہ ہم ان فنون میں اپنی

ہمسایہ قوموں میں اولیت نہیں رکھتے اور نہ ہی ان فنون کی جزئیات پر ہماری پوری دسترس ہے۔ ہاں! چاپلوسی کے فن میں ہم ان سے کہیں آگے ہیں۔ البتہ ہم کفن مہنگا ضرور دیتے ہیں (مگر یہ کفن چوری کی ذیل میں نہیں آتا) اور کفن پر ہمارا فوکس بھی زیادہ ہے وہ اس لیے تاکہ مردہ اور اس کے لواحقین کو شرمندگی سے بچایا جائے کوئی یہ نہ کہہ دے کہ مردے کو سستے سے کفن میں لپیٹ دیا۔ کہیں جاتے جاتے مردہ احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائے۔ ویسے بھی مردے کو سستا کفن دینا مردے کی توہین اور شرافت سے بعید ہے۔ یہاں چور اور چوری کے ضمن میں اہل مغرب کے ایک پروپیگنڈے کی وضاحت بھی ضروری ہے ۔ جس کی رو سے ہماری ہر حکومت کو چور اور ملک پر قرضوں کا بوجھ بڑھانے کا ذمہ دار سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ الزام ٹھیک نہیں کیونکہ قرض وہ واحد بوجھ ہے، جس کا کوئی وزن نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ وزن سر و بدن کو اٹھانا پڑتا ہے بلکہ بدن کے تمام اعضائے رئیسہ اور معاشرے کی تمام ارواح خبیثہ اس بوجھ سے بری الزمہ ہوتی ہیں۔ صرف دماغ کو متحرک و متفکر رہنا ہوتا ہے تاکہ دماغ منجمد اور ماؤف ہو کر نہ رہ جائیں۔ اور پھر کہیں پوری قوم ہی غفلت شعار نہ بن جائے۔ قوم کو جگانے اور دماغ کو حاضر باش رکھنے کے لیے اس سے بہتر نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ ورنہ جدید دنیا میں تو دماغ کو تیز رکھنے کے لیے کتنے ہی معجون، مرکبات اور ادویات استعمال کی جاتی ہیں۔ نائٹ کلبوں کی سہولت تک ملتی ہے۔ پھر بھی قرض کی سہولت سے ناآشنا قوموں کے نوجوان سست اور تفکر سے خالی نظر آتے ہیں۔ چوری چکاری اور سیاست کاری کا موازنہ بھی بڑی حد تک غیر جمہوری اور غیر ضروری ہے۔ چور لاکھ صالح اور صلاحیتوں کا مالک ہو کسی گئے گزرے سیاست دان کے مقابل نہیں ٹھہر سکتا۔ کیونکہ سیاست بچوں کا کھیل نہیں چوری بچے بھی کر سکتے ہیں اور بوڑھے بھی۔ سیاست کو عموماً "آبائی پیشہ کہا جاتا ہے اس کے برعکس چوری ایک وبائی مرض ہے جس کا شکار کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ سیاست میں ہار جیت اور چوری مار پیٹ ہوتی ہے۔ چور کے مقاصد ذلیل اور سیاستدان کے مقاصد جلیل ہوتے ہیں چاہے ذاتی ہی کیوں نہ ہوں۔

اب چور کو کون سمجھائے کہ چوری کے میدان پر سینہ زوری نے قبضہ جما لیا ہے۔ البتہ اس میں چور اور اس کے فن کا کوئی قصور نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ چور کو کاہل اور سست ہونے کا طعنہ دینا بھی ٹھیک نہیں۔ کیونکہ چور طبعاً "عاشق مزاج اور عادتاً "چال باز ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چور سے زیادہ مظلوم اور مہذب کوئی نہیں۔ مظلوم اس حوالے سے کوئی اس کا دوست بننے کو تیار نہیں۔ اس پر مستزاد اس کی نسل بھی تو آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ ایک وہ وقت بھی تھا جب چور اور چوری سے ہماری رغبت اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ہر دل میں چور ہوتا تھا۔ عاشق کے دل میں چور، محبوب کے دل میں چور، افسر کے دل میں چور، ماتحتوں کے دل میں چور، ہر گھر میں چور نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ مگر وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ اب چور جائے تو جائے کہاں۔ کرے تو کیا کرے، نہ تو اپنی وضع چھوڑ سکتا ہے اور نہ ہی ورثے سے منہ موڑ سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چور کا کوئی اقدام تہذیب و تواضع کے خلاف نہیں ہوتا تھا۔ مہذب اس قدر کہ کسی کو جاگتے میں نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ دن کو کسی کے لٹنے کا امکان ہی نہ تھا۔ وہ چوری بھی عبادت اور ریاضت سمجھ کر کرتا تھا۔ نہایت خشوع و خضوع سے، نہایت سلیقے سے، نہایت احتیاط سے، نہایت خاموشی سے، کہ کہیں کسی کی نیند خراب نہ ہو۔ کہیں کوئی بچہ نہ گھبرا جائے، کہیں کوئی خاتون ہڑبڑا کر نہ اٹھ بیٹھے، کہیں کوئی کتا نہ بھونکنے لگے۔ کسی کی عزت نفس مجروح نہ ہو، کسی کے آرام و عیش میں خلل نہ آئے۔ کسی کی خواب گاہ سمیت ہر پہلو کے بارے ہر پہلو میں کافی سوچ بچار کرتا تھا؛ پھر کہیں اللہ کا نام لے کر چوری کے لیے کمر بستہ ہوتا تھا۔ ہم ہیں کہ اس کی

لیاقت اور پارسائی کو سراہتے ہی نہیں۔

دراصل چور کو اپنے پیشے اور فن سے عشق تھا۔ تبھی وہ اپنی راتوں کی نیند حرام کرتا تھا صرف اس سبب سے کہ کہیں یہ فن صفحۂ ہستی ہی سے نہ مٹ جائے۔ اس کے برعکس ہم ہیں کہ کتنی ہی مراعات ملیں، کتنی ہی ترغیبات ہوں، نہ پیشے سے مخلص، نہ اپنے آپ سے، نہ ملک سے، نہ ملت سے۔ میں تو کہتا ہوں کہ چور کا وجود کتنا ہی نامسعود کیوں نہ ہو۔ اس کا طرز عمل آج بھی ہماری زندگیوں میں صبر و شکر کا رنگ بھر سکتا ہے۔ اس لیے چور اور چوری کے فن کا زندہ رہنا مصلحت سے خالی نہیں۔ کیوں کہ آپ تو جانتے ہیں کہ کسی وجود کا نابود ہونا، بہر حال ہماری دنیا کے لیے نیک شگون نہیں کہ ایک ایک شے مٹتے مٹتے سب کچھ مٹ جاتا ہے۔

شہرت گزیدہ

شہرت کا شوق کسے نہیں ہوتا؟ کون ہے جو شہرت کے مرض کا مریض نہیں اور مرض بھی ایسا کہ جس کا شکار بیماری کو خود اپنے دامن و دل میں پناہ دیتا ہے۔ مرض خریدنے کے لیے منہ مانگے دام خرچ کرتا ہے۔ پھر بھی حسرت اس کے دل میں باقی رہتی ہے کہ کچھ زیادہ خرچ کرتا۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ شہرت کے خریداروں میں ہر عمر، عقیدے اور رنگ و نسل کا آدمی ہوتا ہے۔ کون ہے جو شہرت کے لیے سنجیدہ یا رنجیدہ نہیں۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ ہم جتنا جلدی سنجیدہ یا رنجیدہ ہوتے ہیں؛ اس سے زیادہ تیزی سے غیر سنجیدہ ہونے میں بھی دیر نہیں کرتے۔ ابھی ہنس رہے تھے، ابھی رو رہے ہیں۔ ابھی ناراض تھے، ابھی راضی ہو گئے۔ ابھی دوست تھے، ابھی دشمن بن بیٹھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے محبوب سے محبوب چیز کو معتوب اشیاء کے کھاتے میں ڈال دیا۔ شہرت کی طرح ارادہ اور راستہ بدلنے سے نہ ڈرتے ہیں، نہ تھکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ گزشتہ کل کی طرح آج بھی ہر فرد شہرت کے لیے سرگرداں اور شعلہ بہ جاں ہے۔ البتہ حصول شہرت کے ذرائع اور دستیاب وسائل، خرابیاں اور بے تابیاں سب کی جدا جدا ہوتی ہیں۔ کوئی دین اور دیوانگی کے نام پر شہرت حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ تو کوئی دولت کو ہی شہرت کا قبلہ نما اور خدا مانتا ہے۔ کوئی تاریخ کا سہارا لیتا ہے، تو کوئی تحریف کا؛ کوئی تحقیق کا سہارا لیتا ہے تو کوئی تنقیص کا۔ آپس کی بات ہے، انسان جب سے زمین پر آیا ہے، سہاروں کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ جینا تو دور کی بات ہے مرنے کے لیے بھی سہارے تلاش کرتا پھرتا ہے۔ کون سمجھائے کہ زمینی سہارے بھی تو شہرت کی مانند وقتی، ناپائیدار اور عارضی ہوتے ہیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ شہرت کے شہتیر کے آخری سرے پر بوزنہ بنا بندہ نہ زمین پر اُتر سکتا ہے نہ آسمان کی طرف جا سکتا ہے۔ کیونکہ اُسے ڈر ہوتا ہے کہ اگر وہ شہتیر سے اُترا تو کوئی اور اس پر چڑھ بیٹھے گا۔ کیونکہ مبتلائے شہرت کا مقصد نہ بلندی کا حصول ہوتا ہے؛ نہ زمین سے وابستگی ہی اس کا اُصول ہوتا ہے۔ شہرت تو بے سمت سفر ہے؛ جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ بے حد و حساب مسافت طے کرنے کے بعد بھی مبتلائے شہرت سے منزل اتنی ہی دور ہوتی ہے، جتنی آغاز سفر پر تھی۔ شاید نسلِ انسانی کے کوتاہ بینوں کو ہمہ وقت ایسا ہی سفر درپیش رہتا ہے۔ اس سفر کی خرابی یہ ہے کہ شہرت کے پروں پر سوار آدمی پرواز کرتے ہوئے آخر کار اس مقام پر جا پہنچتا ہے۔ جہاں جبری تنہائی اس کا مقدر بنتی ہے۔ خلوت اگر خود اختیاری ہو تو رحمت ہوتی ہے، جبری ہو تو زحمت بن جاتی ہے۔ تنہائی کے تاریک جہاں میں یہاں وہاں کی تمیز ہی مٹ جاتی ہے۔ شُہرت کے دھتکارے ہوئے کو سارا زمانہ اپنا دشمن، مدمقابل اور مخالف دکھائی دیتا ہے۔ شہرت اس پرائے مال کے مانند ہوتی ہے، جسے ہم چُرا تو لیتے ہیں، مگر چھپا نہیں پاتے۔ پھر انسان بقیہ زندگی اسی لوٹ کے مال کو مسلسل سر اور کندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتا ہے۔ کیونکہ اسے ڈر رہتا ہے کہ کہیں کوئی اس سے یہ مالِ مسروقہ چھین ہی نہ لے۔ اس لیے دانا شہرت سے دور اور بے شعور اس کا قُرب چاہتے ہیں۔

ہماری ہمیشہ سے یہ مشکل رہی ہے کہ داناؤں کی بات ہمارے پلے نہیں پڑتی۔ ورنہ مرزا غالبؔ نے تو بہت پہلے کہہ دیا تھا؛

ہوں ظہوریؔ کے مقابل میں خفائی غالبؔ

میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

بات تو انہوں نے سچ کہی تھی کہ شہرت، دلیلِ شرف نہیں ہوتی۔ اگرچہ شہرت کا رستہ مختصر اور جلدی طے ہوتا ہے مگر اس کا قیام مستقل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عظمت اپنی قیام گاہ اور افراد نہیں بدلتی۔ شہرت اس پرندے کی مانند ہوتی ہے جو اپنے شکار کو دلدل میں دھنسا کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اب ستم کا مارا نہ آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ بلکہ شہرت کے طلبگار کے قریب جانے والا بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ شہرت کی کشتی کتنی ہی برق رفتار کیوں نہ ہو، ہمیشہ اپنے مسافروں کو بیچ منجدھار ڈبوتی ہے۔ کسی شے، شخص یا واقعے کی شہرت، چاہے پورے عہد کو ہی اپنی لپیٹ میں کیوں نہ لے لے؛ انجام گمنامی یا بدنامی ہی ہوتا ہے۔ شہرت نہ معیار کی ضامن ہوتی ہے؛ نہ ہی اعتبار کی دلیل ہوتی ہے۔ شہرت کا محور نہ کردار ہوتا ہے نہ اس کا مسکن وقار ہوتا ہے۔ بلکہ شہرت کی بنیاد عموماً کج ادائی اور رسوائی پر ہوتی ہے۔ بدنام کبھی شہرت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتا اور نیک نام کبھی شہرت کے حصول کی تمنا نہیں کرتا۔ جس شہرت کے لیے دن کو رات کیا جاتا ہے یا رات کہا جاتا ہے۔ عزت و شرف کبھی اسے منہ نہیں لگاتے۔ شہرت کیونکہ سانحہ کی پیداوار ہوتی ہے، اس لیے جلد بے وقار ہوتی ہے۔ شہرِ شرف میں جاتے ہوئے شہرت کے پر جلتے ہیں۔ عظمت کے سوتے انسان کے باطن اور بلند کرداری سے پھوٹتے ہیں۔ عظمت کا پودا ذہن و ضمیر و ذات سے غذا لیتا ہے؛ تبھی ہمیشہ تر و تازہ رہتا ہے۔ اسے خزاں نہیں چھو سکتی۔ شہرت ایک مرض لادوا اور وبا ہے؛ جس کی شدت میں کبھی کمی نہیں آتی؛ جو پورے سماج کو اور ارد گرد کو بیمار تو کر سکتی ہے مگر بیدار نہیں کر سکتی۔ اس کا مریض ہل من مزید کی صدائیں دیتا نہیں تھکتا۔ تا آنکہ شہرت کا وقتِ نزع آ پہنچتا ہے۔ شہرت کی بھوک مٹائے نہیں مٹتی۔ کیا خوب کہا گیا ہے کہ شہرت کی بھوک مٹتی نہیں، عظمت کو بھوک لگتی نہیں۔ شہرت کا طلبگار سب کچھ حاصل ہونے پر بھی بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔

شہرت صرف ابنِ آدم کی میراث ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔ شہرت تو وہ بیسوا ہے جو شرفِ آدم پر فریفتہ ہونے کی بجائے کسی لکڑی، پتھر، پہاڑ، پسٹل یا پتلون پر فریفتہ ہونے لگتی ہے۔ مگر جیسے ہی حالات بدلتے ہیں، واقعات کا اثر زائل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شہرت پر بھی گُمنامی کے پردے پڑنے لگتے ہیں اور جس شے یا شخص پر پردے پڑنے لگے یا جس شے پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہو رہی ہو؛ وہ کبھی لائقِ تحسین اور قابلِ تقلید نہیں ہوا کرتی۔ دور کیوں جائیں، شعرا کے مشہور کلام کو ہی دیکھ لیجیے، وہی مشہور کلام جو کسی وقت شاعر کی شہرت کا باعث تھا، آخر میں شاعر کے لیے بدنامی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ پہلے شاعر کے ساتھ الہامی کا لاحقہ جڑا ہوا ہوتا تھا اور اب جب تک شاعر بدکلامی نہ کرے، شہرت نہیں ملتی۔

شہرت بھی عجیب شے ہے جس کے کندھوں پر سوار ہو جائے، اسے اپنا قد بڑا اور کمیت بھاری بھرکم معلوم ہونے لگتی ہے۔ شہرت بات کو فسانہ اور طاقت کو بہانہ بناتی ہے، شہرت کا در جتنی تیزی سے کھلتا ہے، اسی تیزی سے بند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شہرت بے وفا اور بے ردا ہوتی ہے؛ عظمت باوفا اور باحیا ہوتی ہے؛ شہرت بے وقار اور بدحواس ہوتی ہے، عظمت باوفا اور باحواس ہوتی ہے۔ عظمت، دین و دیانت کا گھر ہوتی ہے؛ شہرت عموماً بے ثمر ہوتی ہے۔ عظمت کے سچے موتیوں سے روشنی کے فوّارے پھوٹتے ہیں۔ شہرت کے جھوٹے نگینے وقت کی ذرا سی تپش سے ہی ٹوٹتے ہیں۔ شہرت شباب کے مانند ہوتی ہے؛ تبھی جلد برباد ہوتی ہے۔ شہرت کا گھاؤ ارد گرد کو ضرور زخمی کرتا ہے۔ عظمت ارد گرد کے لیے ہی نہیں، ہر عہد اور فرد کے لیے مرہم اور معیار ہے۔ شہرت گھٹتی بڑھتی چھاؤں ہے؛ شہرت کا ہُما کسی کے سر پر بھی بیٹھ سکتا ہے۔ اس کے لیے زمین و

زمن، مقام و مکن اور شرف و شگن کی کوئی قید نہیں۔ اس کے برعکس عظمت دل اور داخلیت کا شجرۂ طیبہ ہے؛ عظمت انبیاء کی عادت، عزت اور عترت کا نام ہے۔ عظمت کا لہجہ متین اور مہین ہوتا ہے۔ شہرت کا لہجہ ثقیل اور سنگین ہوتا ہے۔ عظمت صرف عظیم انسانوں کے حصے میں آتی ہے۔ اس کے برعکس شہرت کے لیے انسانوں کی تخصیص ضروری نہیں؛ شہرت، اینٹ، پتھر، مکان، درخت، دریا، تیر و تبّر تک کے حصے میں آتی رہی ہے۔ بھانڈ، بھڑ، بھڑوا اور بیٹسمین تک سب یکساں طور پر شہرت پا سکتے ہیں۔ معلوم نہیں کب شہرت ان کے قدم چوم لے۔

بھانڈ کی تو ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی پگڑی اور دوسرے کی عزت اُچھال دے۔ بھڑ اور بھڑوے کی شہرت کا سبب ہی یہ ہے کہ سب سے پیار جتاتے ہیں مگر جو انہیں منہ لگالے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ کتنے ہی بھانڈ بادشاہوں کے درباروں میں شہرت حاصل کر گئے اور شہرت حاصل کر رہے ہیں۔ مگر نہ کل انہیں کسی نے عزت کی نگاہ سے دیکھا تھا نہ آج انہیں کوئی لائق تعظیم سمجھتا ہے۔ بھینس اور بیٹسمین کی شہرت سے کون واقف نہیں، چاہیں تو لٹیا ڈبو دیں، چاہیں تو دودھ کی نہر بہا دیں۔ اس لیے داناؤں کا کہنا ہے کہ شہرت کے قرب سے عقل موٹی ہوتی ہے۔ اور موٹاپا تو اُمّ الامراض ہے۔ عقل موٹی ہو تو عظیم الجثّہ چیزیں بھی بے وقعت نظر آنے لگتی ہیں۔ ایسی عقل دوسروں کی طاقت اور طبیعت کا اندازہ کر ہی نہیں سکتی۔ نتیجتاً شہرت گلے کا طوق اور ملامت کا باعث بن جاتی ہے۔

شیطان سے مذاکرات

وعدہ کریں! اگر آپ کو شیطان سے مذاکرات کا حال بتایا جائے تو آپ اس راز کو طشت از بام نہیں کریں گے۔ پہلے آپ قسم کھائیں، اپنے عقیدے کی یا اندوختے کی کہ یہ راز کسی تک نہیں پہنچائیں گے۔ ناراض نہ ہونا بھائیو! آپ کی عادت سے بڑا ڈر لگتا ہے، جس کام سے منع کرو، ضرور اسی میں ٹانگ اڑاتے ہو۔ آخر چوری چکاری، ہیرا پھیری، راہ زنی، جھوٹ، مکر و فریب جیسے دیگر افعال شنیعہ سے بھی تو ہمیں منع ہی کیا گیا ہے۔ کیا ہم باز آئے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ بات کا بتنگڑ ہی بنا ڈالیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ شیطان سے ہماری ملاقات کو ہرگز کارنامہ قرار نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی اس ملاقات کو تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ بلکہ شیطان سے ملاقات کو منفی، غیر حقیقی اور غیر اخلاقی رنگ دینے کی کوشش کی جائے گی اور طرح طرح کی گفتنی اور ناگفتنی باتیں ہمارے اور شیطان کے بارے میں کہی جائیں گی۔ خیر کوئی بات نہیں ہمیشہ خلوص نیت سے کام کرنے والوں کے ساتھ ہی ایسا سلوک روا رکھا جاتا رہا ہے۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آپ خود تو فضاؤں میں اڑتے پھریں، سمندروں میں غوطے لگاتے رہیں اور ہم کسی سے ملنا بھی چاہیں تو آپ کے اعتراضات کی لاٹھی ہمارا راستہ روک رہی ہو۔ لاٹھی سے یاد آیا کہ آپ کے اور میرے بزرگ لاٹھی کو کبھی خود سے جدا نہ کرتے تھے۔ کبھی ناگہانی حادثے سے بچنے کے لیے یا پھر اس خوف سے کہ کہیں سر راہ کسی شیطان سے ملاقات ہی نہ ہو جائے۔ شاید اس زمانے میں شیطان اعظم کا تصور اس قدر راسخ نہ ہوا ہوگا اور چھوٹے موٹے شیطان کے لیے لاٹھی کو کافی سمجھا جاتا ہوگا۔ یہ تو شیطان اور اس کے چیلوں چپاٹوں نے اب پر پرزے نکالے ہیں اور اتنے طاقتور ہو گئے ہیں کہ ان سے ہر انسان خوف کھانے لگا ہے۔ خیر کسی کی پیٹھ پیچھے برائی ٹھیک نہیں ہوتی اور ایسا بھی تو ممکن ہے کہ کوئی شیطان کان لگائے یہ سب باتیں سن رہا ہو۔

آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شیطان بظاہر روشن خیال اور سیکولر نظر آتا ہے مگر درحقیقت سر سے لے کر پاؤں کے تلوؤں تک تعصب میں ڈوبا ہوا ماورائی وجود ہے۔ جو نہ کل ہمارا خیر خواہ تھا، نہ آج ہے اور نہ کل خیر خواہ ہو جائے گا۔ کون ہے جو شیطان کے شر سے انکار کرے گا اور آپ میں سے تو اکثر کو شیطان سے واسطہ رہا ہوگا، بس اتنے فرق کے ساتھ کہ کسی کا شیطان سے کبھی کبھار واسطہ پڑتا ہے اور کسی کسی کا تعلق گہرا اور ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے یا پھر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی فرد کا شیطان سے زیادہ واسطہ نہ رہا ہو اور شیطان بلاواسطہ ہی اس فرد پر خصوصی نگاہ ستم رکھے ہوئے ہو۔ یقین سے کچھ کہنا تو فی الحال قبل از وقت اور قابل گرفت ہوگا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے وہ فرد بھی شیطان پر نگاہ رکھے ہوئے ہو۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کہتے ہیں کہ شیطان نے ایک مرتبہ تنہائی اور روز روز کی پھٹکار سے گھبرا کر راہ راست پر آنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر شیطان پر نگاہ رکھنے والوں نے شیطان کو مزید گمراہ کر کے ہی دم لیا۔ ایسے میں شیطان نے چاروں طرف دیکھا تو ہوگا، مگر کوئی مددگار نہ پا کر لعنت ملامت کیے بغیر ہی خاموش ہو گیا ہوگا۔ یہ شیطان کی دوسری شکست تھی۔ پہلی شکست میں اس کے تدبر و تکبر کا دخل تھا۔ مگر دوسری شکست کا سبب شیطان آج تک بتانے سے گریزاں ہے۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ شیطان بھی سبکی محسوس کرتا ہے۔

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے ہر قابل گرفت فعل، فساد، فتنہ یا فتور کا ذمہ دار شیطان ہی ہوتا ہے۔ کوئی آدمی چاہے کتنا بڑا سورما ہی کیوں نہ ہو؛ پاؤں پھسلنے سے لے کر قتل کرنے یا قتل ہونے تک، کسی بھی نوعیت کا کوئی کام شیطان کی ترغیب، تحریص، تجویز اور

اعانت کے بغیر انجام نہیں دے سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ پاؤں مرد کا پھسلے تو دھڑن تختہ بھی مرد کا ہی ہوگا اور اگر پاؤں کسی نازنیں کا پھسلے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنوں کا دھڑن تختہ ہوگا؟

تبھی کہتا ہوں عقلمندی کا تقاضا ہے کہ شیطان سے براہ راست ٹکر لینے کی بجائے مذاکرات اور ملاقات کی راہ اپنائی جائے۔ ورنہ خوشگوار اور لذت آگیں زندگی کا تصور خواب وخیال ہو کر رہ جائے گا۔ شیطان سے ملاقات کی راہ میں رکاوٹ اور روڑے اٹکانے والوں کو کوئی کیا سمجھائے کہ شیطان سے خدا واسطے کا بیر کوئی ٹھیک بات نہیں۔ ابلیس ہمیشہ ہمارا بے دام غلام بن کر رہتا ہے۔ آپ شیطان کو لاکھ برا کہیں، لاکھ لعنت ملامت کریں، لاکھ الزامات کی بوچھاڑ کریں، شیطان ہے کہ ہماری خواہش وخیال ہی کو بھانپ کر ہماری مدد کو فوری آن موجود ہوتا ہے۔ کبھی بیماری آزاری کا بہانہ نہیں بناتا۔ کبھی تھکاوٹ رکاوٹ کا ملال نہیں، کبھی مصروفیت کا خیال نہیں، بلکہ آپ کے ہر فعل پر فعل شیطان کی مہر لگا کر برستی لعنتوں کو خوش دلی سے آگے بڑھ کر وصول کرتا ہے کسی محبنوں کی طرح۔ مگر ہم ہیں کہ شیطان سے کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتے۔

اس کا سبب ایک غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ شیطان کے ضدی اور جھگڑالو ہونے کے بارے میں جو کہانیاں ہم تک پہنچی ہیں انہوں نے ہمیں ہی نہیں خود شیطان کے ساتھیوں کو بھی بڑی حد تک ڈانواں ڈول کر دیا ہے۔ اس لیے کبھی وہ شیطان کے حمایتی اور کبھی مخالف بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حق بات کہنی چاہیے۔ اگر شیطان ہمارا حقیقی دشمن بن کر ضد پر اڑ جاتا اور لعنتوں کی وصولی میں فراخ دلی کا مظاہرہ نہ کرتا اور لعنتوں کی برابر برابر تقسیم کی ضد کرتا، تو اب تک کتنی ہی انسانی آبادیاں لعنتوں کے بوجھ تلے کراہ رہی ہوتیں۔

خدا کے بندو! ذرا سوچو شیطان اکثر ہماری آرزوؤں کی تکمیل کے راستے تلاش کرتا ہے، کہانیاں بنتا ہے، ذرائع سجھاتا ہے، منزل مراد تک پہنچاتا ہے اور کبھی تمغۂ حسن کارکردگی کی خواہش بھی نہیں کرتا۔ نہ شہرت کا طلبگار بن کر اوچھی حرکتیں کرتا ہے۔ بس خاموشی سے ڈیوٹی سرانجام دیتا رہتا ہے۔ ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کیے بغیر، گدھے کی طرح اپنے کام میں جتا رہتا ہے۔ لہذا کوئی کچھ کہے؛ شیطان سے مذاکرات کے پروگرام میں تبدیلی گوارا نہیں۔

آپ شیطان کے بارے میں جو بھی رائے رکھیں جو راستہ اپنائیں؛ چھپ جائیں یا چپ رہیں. مگر حق یہ ہے کہ شیطان کبھی دعوت مبارزت نہیں دیتا۔ بس نرمی سے، لگاوٹ سے، آپ کے قریب آتا ہے، کسی محبوب آشنا کی طرح۔ آپ کو یقین نہیں تو غور اور تجربہ کرنے میں کیا قباحت ہے۔

شیطان کے بارے میں طرح طرح کے تصورات، کہانیاں اور باتیں ہمارے شعور اور لاشعور کا حصہ بنا دی گئی ہیں۔ اس لیے ہم ابلیس کے بارے میں نفرت سوچتے ہیں اور نفرت سینچتے ہیں اور نفرت ہی اگاتے ہیں۔ جیسے شیطان نہ ہو، ہمارا مذہبی یا سیاسی دشمن ہو۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ہم ہر خفیہ اور اہم منصوبے کی مشاورت کے لیے شیطان کی طرف اعانت طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسے اہم کاموں اور کارناموں کا نام بھی ہم نے شیطانی فعل ہی رکھ چھوڑا ہے تاکہ ابن آدم پر کوئی الزام نہ آئے۔ ہم کبھی شیطان کی اس اعانت دوستانہ کا برملا اظہار نہیں کرتے۔ نہ ہی رسمی یا غیر رسمی طور پر شیطان کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ بلکہ موقع ملتے ہی برا بھلا کہنے پر اتر آتے ہیں۔ طرح طرح کے گفتہ وناگفتہ الزامات شیطان کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ خوب لعنت

ملامت کرتے ہیں۔ تھو تھو کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے شیطان بھی ہماری لعنت ملامت کے جواب میں کبھی کبھی ہمیں لعنت ملامت کرتا ہو، جو ہمیں سنائی نہ دیتی ہو۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ ہمارا بار بار شیطان سے مدد کا طلبگار ہونا اور ہر جرم کے ارتکاب کے لیے شیطان پر انحصار کرنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شیطان کے حوصلے بے حد بڑھ گئے ہیں۔ اس نے شرم و حجاب کا زیور اتار کر ایک طرف پھینک دیا ہے۔ اس کی دیدہ دلیری کا اب یہ عالم ہے کہ ہمیں جہاں دیکھتا ہے، درانہ چلا آتا ہے؛ نہ مسجد چھوڑتا ہے، نہ مندر، نہ کلیسا، نہ مکتب، نہ مدرسہ، نہ گھر، نہ سکول، نہ کالج، نہ دفاتر، نہ ہسپتال؛ کوئی بھی جگہ اس سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ اکثر مقدس مقامات میں بھی داخل ہو جاتا ہے۔ اب تو اکثر مقدس مقامات شیطان کے نشانے پر ہیں۔ تبھی تو دن دیہاڑے شیطانی فعل کی خبریں زبان زدِ عام و خاص ہو گئی ہیں۔ اسے شیطان کی ہم نوائی کہیں یا کوئی اور نام دیں۔ اب تو کوئی بھی شیطانی فعل پر پابندی لگانے کی بات نہیں کرتا۔

بات کو طول کیا دینا ہم تو شیطان سے ملاقات اور مذاکرات کا احوال آپ کو بتانا چاہ رہے تھے۔ ملاقات سے پہلے شیطان کے بارے میں میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات سمائے جا رہے تھے۔ کئی گمراہ کن تصورات مجھے شیطان سے قریب لے جاتے اور کبھی دور کر دیتے۔ پہلا خیال تو میرے ذہن میں شیطان کی شکل و شخصیت کے حوالے سے آیا۔ ایسا آپ بھی سوچ سکتے ہیں۔ مثلاً شیطان کی شکل ڈراونی اور کریہہ ہو گی ناک چپٹی چہرہ بھدا اور حبشیوں جیسا ہو گا انتہائی قابل نفرت اور بھیانک یا پھر شیطان گوروں جیسی انکھیں اور شاطرانہ عادات کا مالک ہو گا یا پھر ہر چہار جانب سے برستی لعنت کے بوجھ سے کراہ رہا ہو گا اگر ایسا نہ ہوا تو بوڑھی طوائف کے روپ میں نوجوان نسل کو ترغیب گناہ دیتا نظر آئے گا طوائف کے روپ میں گھور کر دیکھتا ہو۔ گا تو کیا لگتا ہو گا یا پھر امریکن حبشی النسل کی طرح غصے میں دیکھتا ہو گا تو معمولی کارندوں کی گھگھی بندھ جایا کرتی ہو گی یا پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میرے تمام تصورات اور اندیشے اور آپ کے تمام اندازے بھی غلط ثابت ہوں اور !شیطان الٹی چھلانگیں لگانے کی پریکٹس کر رہا ہو آخر شیطان ہے۔ شیطان کی الٹی چھلانگیں بھی کیا غضب ڈھاتی ہوں گی

اب شیطان سے ملاقات کا مرحلہ آن پہنچا تھا میں نے ہزار کوشش کی کہ مجھے دربار شیطان میں اذن باریابی ملے مگر شیطان کے حواری، گماشتے اور منشی برابر لیت و لعل سے کام لے رہے تھے مگر کیا کروں میں ہٹیلی طبیعت اور ضدی مزاج کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ شیطان سے ملاقات بچوں کا کھیل نہیں بلکہ بڑوں کا کھیل بھی نہیں مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ آخر ایک دن شیطان کے ملازمین خاص سے راہ و راسم بڑھا کر دربار خاص میں جا پہنچا۔ چشم تحیر سے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑے ہال میں جہاں آسائش و زیبائش دنیا کا تمام سامان موجود ہے۔ شیطان ایک بلند و بالا کرسی پر براجمان ہے۔ شیطان کے ارد گرد تمام چھوٹی بڑی کرسیاں خالی پڑی ہیں۔ کئی طرح کے ٹیلی فون اور جدید حالات میز پر سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ شیطان نے رعونت سے مجھ پر نگاہ ڈالی اور پھر نہ جانے کس اہم کام میں مصروف ہو گیا۔ مجھے شیطان کی شیطنت پر بہت غصہ ایا غصے میں بھول گیا کہ سامنے کرسی پر کوئی عام ادمی ہے یا شیطان۔ میں نے اسے کہا: او شیطان! خبیث، لعین، مردود، راندہ درگاہ، تمہاری یہ جرأت کہ تم حضرت انسان اشرف المخلوقات کے ساتھ اس قدر تکبر اور غرور سے پیش اؤ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے تکبر کا اللہ تعالی نے کیا حشر کیا تھا تمہیں گستاخی کی کتنی بڑی سزا ملی تھی مگر شیطان تُو اپنے حرکتوں سے باز نہیں ائے گا میں نے غصے میں اس کی طرف تھوکنا بھی چاہا مگر میرا حلق خشک ہو گیا میں نے

آخری حربہ استعمال کیا اور اسلامی کلمہ لاحول کا ورد شروع کر دیا مگر شیطان ڈٹا رہا بر ابر مسکراتا رہا میں شیطان عالی ظرفی بردباری اور رعب و دبدبے کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا۔

بھائیو! معاف کرنا۔ ایک مرتبہ پھر معافی چاہتا ہوں خطا شیطان کی عادت اور انسان کی سرشت میں شامل ہے میں آپ کو شیطان کا سراپا بتانا بھول گیا۔ تو، سنو! خدا جھوٹ نہ بلوائے شیطان کا چہرہ بارونق، رنگت سرخ و سفید تھی ہاتھ نفیس اور مرمریں تھے کسی خیالی محبوب کی طرح جیسے گرد اور گرمی یا ہجوم غم سے اس کا واسطہ ہی نہ رہا ہو آنکھیں روشن روشن تھی شاید دل سیاہ ہو؛ کیونکہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ ہونٹ رسیلے اور ابرو مناسب تھے۔ کمبخت ہنستا تھا تو پھول جھڑتے تھے۔ مگر ہاتھ نامناسب حد تک لمبے تھے۔

میں نے ضروری سمجھا کہ شیطان سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں اور شناسائی پیدا کر لوں کیونکہ مجھے آپ کے دیے ہوئے مینڈیٹ کا بھی تو خیال تھا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی شاید ایسا ہی کرتا یا یوں بھی سوچا جا سکتا ہے کہ شیطان کو اکیلا پا کر گتھم گتھا ہو جاتا اور اس کا سارا کھیل بگاڑ دیتا اور اس کی رعونت خاک میں ملا دیتا یا پھر ممکن ہے کہ شیطان کے ساتھ مل کر کسی شیطانی کھیل میں مصروف ہو جاتا۔ بہر حال مجھے شیطان کی روایتی مصروفیات کا پہلے ہی سے ادراک تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے شیطان سے کہا، بھائی شیطان! آخر ہم غریبوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ تو ہماری ذلت کے درپے ہے شیطان نے معمولی جھرجھری لی اور شیطانی لب کھولے تو اس کے لہجے میں پیار کی مہک اور نسوانیت کی جھلک تھی میں نے چونک کر دیکھا تو شیطان حسینۂ عالم کے روپ میں سامنے تھا بس میں تو سب کچھ بھول کر شیطان کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوتے ہوتے رہ گیا معلوم نہیں آپ ہوتے تو آپ کی حالت غیر ہوتی یا نہیں۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ میں اس ظالم کے لیے صیغہ مذکر استعمال کروں یا مؤنث۔ بس میں نے عجلت میں فیصلہ کیا کہ حسب حال ہی مخاطب کرنا چاہیے اور میں نے آہستہ سے کہا، شیطان کہیں کی؛ میری اس جرأت پر شیطان بھی مسکرائی۔

دوسرے لمحے میں نے خود کو سنبھالا اور گویا ہوا۔ اے شیطان! تو بہت چالاک اور عیار ہے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے تو نے مجھے شیطانی جال میں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ خدا اور اس کے نیک بندے تجھ پر اور تیرے پیروکاروں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ شیطان سب کچھ تسلی سے سنتی رہی یا سنتا رہا۔ پھر اچانک شیطان نے میرے الزامات کو یکسر مسترد کر دیا۔ مجھے ظالم کے ڈھٹائی پر از حد غصہ آیا مگر میں کیا کرتا۔ دربار اسی کا تھا، راج اسی کا تھا، بندے اسی کے تھے اور میں اکیلا؛ میں نے جرأت کر کے سوال کو آگے بڑھانا چاہا، میری نگاہ جو شیطان پر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیطان فرشتہ صورت بنائے بیٹھا ہے۔ پیشانی سے نور کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ میں نے کہا تم چاہے سو شکلیں تبدیل کرو۔ آخر تمہیں کون نہیں جانتا، دوران ملاقات اس نے مجھے ہراساں اور خوفزدہ کرنے کی بھی کوشش کی اور کئی روپ بدلے۔ متعدد مرتبہ مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہمیں ہمارے جائز حقوق سے محروم رکھنا چاہتا تھا۔ کبھی وہ قانون دان کے مقدس پیشے کو بدنام کرنے کے لیے گاؤن پہنے دکھائی دیتا۔ کبھی کسی کا بہروپ بھر لیتا۔ کبھی آپ کا اور کبھی خود میرا۔ حد تو یہ ہے کہ شیطان اعلیٰ مناصب پر فائز لوگوں کی شکل میں آتے دیر نہیں لگاتا تھا۔ دوران گفتگو ظالم شیطانی یونیفارم پہنے جو گرجا تو میں خوب ڈرا۔ مگر جب اس نے میرے کندھے پر منافقانہ ہاتھ رکھا، تو میرا سارا خوف جاتا رہا۔ شروع شروع میں مذاکرات کا ماحول کشیدہ

رہا۔ جھوٹ کیوں بولیں، دو طرفہ شکوے اور شکایتیں بھی ہوئیں، آہستہ آہستہ ماحول خوشگوار ہو گیا۔ پھر تو باہمی دلچسپی کے امور پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ باہمی دلچسپی کے امور پر بات چیت کرتے ہوئے محسوس ہوا کہ شیطان نظریاتی طور پر رجعت پسند نہیں۔ اس کے پاس کئی آپشنز تھے، کئی عہدے تھے، اعزازی شیطان کا عہدہ بھی اس نے خالی رکھا ہوا تھا۔ اس نے بعض مراعات دینے کا بھی وعدہ کیا جو فی الحال عوام الناس کے مفاد کے پیش نظر صیغۂ راز میں رہیں گی۔ مشترکہ اعلامیہ بھی میری درخواست پر جاری نہ کیا گیا۔ رخصت کے وقت شیطان نے مجھے الوداع اور میں نے اسے خدا حافظ کہا۔ شیطان نے مجھے خیر سگالی جذبے کے تحت ایک ٹوپی بھی مرحمت فرمائی، جسے آپ شیطانی ٹوپی کہہ سکتے ہیں۔ احسان فراموشی بد فطرتی کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ احسان کرنے والی ہستی کی قدر کی جانی چاہیے؛ چاہے وہ شیطان ہی کیوں نہ ہو۔ شیطان ٹوپی عجیب و غریب کمالات اور اثرات رکھتی تھی جسے پہنتے ہی آپ ہر انسان اور شیطان کو اس کی اصلی اور حقیقی صورت میں بآسانی دیکھ سکتے تھے یا پھر آپ اپنی حقیقت کو چھپانا چاہیں تو بھی شیطانی ٹوپی کارآمد تھی۔

شیطانی ٹوپی کا میرے ہاتھ میں آنا تھا کہ میرے شب و روز بھی بدل گئے۔ میرے علاوہ کوئی اور بھی ہوتا تو اس کے بھی شب و روز ایسے ہی بدل جانے تھے۔ ہر لحظہ مومن کی نئی آن اور نئی شان تھی۔ مومن سے مراد میں خود ہوں یا آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے پاؤں پہلے بھی زمین پر کم لگتے تھے، اب تو میں ہواؤں میں اڑنے لگا۔ آج اس محفل کی صدارت کر رہا ہوں، کل کسی سینما کی افتتاحی تقریب میں میر مجلس بنا بیٹھا ہوں، جہاں بھی جاتا ہوں شیطانی کارندے میرے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ میں انہیں اور وہ مجھے دور سے ہی پہچان لیتے ہیں۔ ہر مجلس، ہر محفل، ہر جلسہ، ہر دفتر، ہر اجتماع میرے جاننے والوں اور میرے دوستوں کا رہین منت ہوتا ہے۔ سب کے پاس شیطان کی طرف سے خیر سگالی کے پیغامات آ رہے ہیں۔ جوابی پیغامات جا رہے ہیں۔ پہلے میں جن سے خوف کھاتا تھا اب وہ مجھ سے دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ بزرگی کے تاج پہنائے جا رہے ہیں اُتارے جا رہے ہیں۔

بھائیو! ذرا انصاف کرنا، مگر بھائیو، آپس کی بات ہے مجھے آپ کے جذباتی پن سے خوف آ رہا ہے۔ آپ لوگ مجھ پر شیطان سے ملی بھگت کا الزام لگانے کی کوشش کریں گے۔ الزام لگانا آسان ہوتا ہے اور ثابت کرنا مشکل۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، شیطانی نظام ایک بین الاقوامی نظام ہے، میری باتیں غور سے سنو، بے جا ضد کی بدولت آدمی جان اور ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ شیطانی نظام میں آزادی کا تصور جس قدر حقیقی ہے کسی اور نظام میں نہیں۔ دوستو، یہ ایسا نظام ہے جو کروڑوں سالوں سے قابل عمل اور قابل قبول چلا آ رہا ہے؛ زمانے میں انقلابات آتے رہتے ہیں یہ ہمارے لیے سنہری موقع ہے کہ فرسودہ تصورات کو خیرباد کہتے ہوئے ہم بھی شیطان انسان دوستی کی لازوال تحریک کی بنیاد رکھیں۔ آخر ہر معاملے میں اور ہر مرحلے پر تقلیدی روش کیوں اپناتے ہیں۔ ہمیں دوسروں کے لیے مثال بننا ہوگا۔ ہم ہمیشہ ایسے سنہری مواقع گنوا دیتے ہیں۔ مگر اس مرتبہ ہم شیطان سے مذاکرات کے ثمرات غیروں تک نہیں پہنچنے دیں گے۔

قینچی

قینچی جسے مقراض اور کَترنی بھی کہتے ہیں، بہت عرصہ تک حالت گُمنامی میں رہی۔ کیونکہ پرانے زمانے میں قینچی کا کوئی خاص مصرف نہیں تھا، اس لیے نگاہوں سے اوجھل رہی۔ ممکن ہے قینچی نے گُمنامی کی اس صورت کو پسند نہ کیا ہو مگر گُمنام ہونے کا ایک فائدہ ضرور ہے کہ کوئی کتنا ہی لائقِ دُشنام کیوں نہ ہو گُمنامی اسے دُشنام سے بچائے رکھتی ہے۔ بُرا ہو بدگُمانی کا کہ قینچی نے اپنی گُمنامی کو انسان کی بے اعتنائی پر محمول کیا۔ عام طور پر ایسے ہی گُمانوں سے عداوتیں جنم لیتی ہیں۔ گُمان یہی ہے کہ انسان اور قینچی کے درمیان مُخاصمت کی ابتدا اسی بدگمانی سے ہوئی۔ سبب کچھ بھی ہو، انسان اور قینچی ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ ایک طویل عرصے تک قینچی سے معمول کے اور معمولی نوعیت کے کام لیے جاتے رہے۔ یعنی بال کاٹنا، کپڑے کترنا یا پودوں کی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی شاخوں یا کونپلوں کو تراشنا۔ اس دورِ گُمنامی میں قینچی، عموماً درزیوں کے پاس سارا دن بیکار پڑی رہتی۔ بس لے دے کے صرف ایک نائی تھا؛ جو قینچی کی حمایت پر کمربستہ رہا۔ صرف اسی کے ہاں قینچی تکریم پاتی تھی اور اُسترے کے کُند ہونے پر اُسترے کی قائم مقام کا کام دیتی تھی۔ قینچی سے عہدِ قدیم سے ہی نائی اور درزی اپنی پیشہ ورانہ ضروریات پوری کرتے رہے ہیں۔ اگر غیر پیشہ ورانہ ضروریات بھی پوری کرتے رہے ہوں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ کسی کی نیت اور نصیب پر پہرہ بٹھانا ممکن نہیں۔ زمانۂ جاہلیت ہی سے قینچی سے غیر پیشہ ورانہ اور خفیہ نوعیت کے کام لیے جانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس لیے جب جب اور جہاں جہاں تاریخ میں قینچی چلائی گئی، وہاں وہاں صدیوں سے خون آشامی کا سلسلہ رکنے میں نہیں آرہا۔ چنانچہ قینچی سے انسان کی نفرت بڑھی۔ عام خیال ہے کہ دنیا میں امن و سلامتی کے فُقدان کا راز قینچی کے انسان سے نہ ختم ہونے والے عناد میں پوشیدہ ہے۔ دبے لفظوں میں احتجاج بھی ہوا۔ مگر احتجاج کو کون پوچھتا ہے؟

قینچی نے بے کاری، آزاری کے زمانے دیکھے۔ کس مپرسی کے عالم میں کئی صدیاں گزاریں۔ یہ تو کہیں بہت بعد میں معاشرہ مہذب ہوا تو قینچی کے دن پھرے؛ معاشروں کو قینچی آشنا بنانے میں بہت محنت اور وقت صرف ہوا۔ تب کہیں جا کر قینچی کو شہرت اور انسان کو آزادی سے قینچی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ورنہ کچھ عرصہ پہلے تک تو قینچی کے حوالے سے نفرت اور تعصب کا یہ عالم تھا کہ ہماری سماجی اور مذہبی زندگی میں قینچی کے لیے استہزائیہ کلمات بڑے فخر سے ادا کیے جاتے تھے۔ کئی شعبہ ہائے زندگی میں قینچی کا استعمال ممنوعہ ادویات کی مانند تھا۔ ثِقہ حضرات، ظالم سے ظالم حکمران، زہریلے سے زہریلے سانپ یا جان لیوا بیماری سے اس قدر دور نہیں رہتے تھے؛ جس قدر قینچی کے نام پر ناک منہ چڑھاتے تھے۔ یعنی ان زمانوں میں ہماری معاشرت تیغ و تبر کی دیوانی تھی۔ تا آں کہ مغرب نے قینچی کو قعرِ مذلّت سے نکالنے کا بیڑا اٹھایا۔ قینچی کی افادیت و اہمیت کے موضوع پر سیمینار کرائے گئے، مقالات لکھے گئے، لیکچر ہوئے؛ تب ہماری آنکھیں کھلیں اور کان قینچی آشنا ہوئے۔ غیریت کے پردے ہٹے تو انسان نے قینچی کے اوضاع و اطوار کا نیچے سے اُوپر تک کا جائزہ لیا تب ہم پر کھلا کہ قینچی صرف کاٹتی نہیں اس سے کئی اور بھی مفید کام لیے جا سکتے ہیں۔

تعصُّب اور طرفداری اپنی جگہ پر، مگر یہ حقیقت ہے کہ اہلِ مغرب تحقیق کے رسیا ہوتے ہیں۔ قعرِ گُم نامی میں گھرے اور گِرے ہوؤں کے لیے اہل مغرب کی تحقیق ہمیشہ زندگی کا پیغام لاتی ہے۔ جس طرح اہلِ مغرب نے کتوں، گدھوں اور جنسی مریضوں

کو قعرِ ذلت سے نکالا اور انہیں نئی زندگی عطا کی۔ اسی طرح قینچی کو بھی قعرِ ذلت سے نکالا۔ اہل مغرب کی عنایات سے پہلے قینچی سے اس طرح کا التفات کون برتتا تھا۔ آپ سب کے علم میں ہے کہ وہ وقت بھی تھا جب بادشاہ یا سپہ سالار کسی شہر کی بنیادیں اُٹھاتے تھے تو شمشیر زن ساتھ ساتھ ہوتے تھے یا دشمن کے کسی شہر کی بنیادیں ڈھائی جاتی تھیں تو بھی تلواریں ہی بے نیام کی جاتی تھیں۔ ایسے میں قینچی بردار اگر لشکروں میں شامل ہوتے بھی تھے تو پیچھے کہیں لشکر کی دھول چاٹتے رہتے۔ یعنی امن و جنگ دونوں صورتوں میں شمشیر اور بازوئے شمشیر زن پر بھروسہ کیا جاتا تھا۔ ہر سردار اور سالار تلوار ہی زیب تن کرتا تھا۔ کسی سردار یا سپہ سالار کو کوئی مہم سپرد کی جاتی تو اسے تلوار ہی عطا کی جاتی تھی۔ ایسے میں قینچی خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوگی۔ حد یہ ہے کہ آج بھی سالار اعلیٰ کو قینچی پیش نہیں کی جاتی حالانکہ وزن میں بالکل ہلکی ہوتی ہے اور جیب میں بھی آسانی سے سما سکتی ہے۔

کیا زمانہ تھا جب میدان جنگ میں صرف تلواریں ہی کڑکتی یا چمکتی تھیں۔ نیزوں کی انیاں ہی ٹکراتی تھیں۔ تلوار ہی فتح و ظفر مندی کی علامت تھی۔ فتح کے جھنڈے گاڑے جاتے تھے۔ جھنڈے کی توہین پر قوموں، قبائل اور ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جایا کرتی تھی۔ غرض، امن یا جنگ دونوں صورتوں میں تلوار کو پذیرائی ملتی تھی اور قینچی کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مگر وقت سدا ایک جیسا نہیں رہتا۔ وقت بُرا ہو یا بھلا ہو، گزر جاتا ہے۔ تلوار کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ وقت کے ساتھ تلوار کی توقیر، ضرورت اور دہشت ناکی کا زمانہ جاتا رہا۔ پھر وہ وقت بھی آیا، جب تلوار ڈرائنگ روم کی زینت بنی۔ حنوط شدہ مچھلی، مگرمچھ اور عقاب کے بیچوں بیچ پلاسٹک کی چھریوں کے ساتھ تلوار سجا دی گئی۔ نفیس طبع لوگوں نے زیادہ کیا تو طلائی تلوار گلے میں حمائل کر کے اپنے ذوق کی تسکین کر لی۔

حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ سماج نے اپنا رنگ بدلا، تو بازوئے شمشیر زن کی جگہ بازوئے نازک بدن اور سیمیں بدن کی اصطلاحیں عام ہونے لگیں۔ یہی وہ وقت تھا جب قینچی کے خاموش لب کھلے۔ یوں بھی نازک اندام کے لیے بھاری بھرکم تلواریں اُٹھانا اب آسان نہ رہا تھا۔ اس پر مُستزاد حق کے لیے تلوار اٹھانا تو ممکن ہی نہ تھا۔ جسمانی کمزوری بھی وجہ ہو سکتی ہے مگر اخلاق و کردار پہلے آتا ہے۔ تلواریں زنگ آلود ہو چکی تھیں۔ زنگ آلود تلواروں کو کون صیقل کراتا پھرتا۔ وہی تلوار جو کل تک مردانگی اور شرافت کی علامت سمجھی جاتی تھی اور وہ جوانِ رعنا جو کل تک تلوار کے لیے تڑپتے تھے، قینچی کو دل دے بیٹھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قینچی وقار و معیار کی علامت بن گئی۔ کیا مرد کیا عورت ہر ایک قینچی کے بغیر خود کو ادھورا ادھورا تصور کرنے لگا۔ یہاں تک کہ کسی تقریب میں قینچی کے بغیر جانے کو عیب تصور کیا جانے لگا۔ پہلے دودھ شریک بھائی ہوتے تھے تو اب قینچی شریک ہونا اہم ہو گیا۔ باور کرنا چاہیے کہ اگر یہی عالم رہا تو قینچی کی پرستش کا در جلد کھلے گا، قینچی کو مقدس جان کر چھونے سے محروم ہو جانے والے خود کو بدقسمت تصور کریں گے۔ کتنے ہی لوگ قینچی کی افادیت کے قائل ہو ہو کر اپنی قبل از وقت پیدائش پر پچھتائیں گے۔ کچھ تو ایسے بھی ہوں گے جو اپنے قبائل و خاندان کی گزشتہ زندگی پر نفرین کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ صبح و شام خود کو لعنت ملامت کرتے نہ تھکیں گے۔ تنہائی میں خود کو غلیظ گالیاں دینے سے بھی نہیں چوکیں گے۔ آباواجداد کی کم عقلی کا ماتم کرتے پھریں گے کہ انہوں نے ناحق تلوار اُٹھائی اور شہر کے شہر تہ تیغ کیے۔ افسوس! انہیں قینچی سے کام لینے کا ہنر نہ

آیا۔ اس زمانے میں شاید شیطان بھی اتنا عیار اور چالاک نہیں تھا؛ ورنہ وہ قینچی کی اہمیت، روشن دلیلوں سے واضح کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ شیطان میں سچی شیطانت زمانے کے رنگ دیکھ کر ہی پروان چڑھی ہو۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اور تلوار کے نام لیوا ایک ایک کر کے زندگی کی دہلیز عبور کرتے چلے گئے۔ رہن سہن کا رنگ بدلا ہے، تو پرانے ساز و سامان کو ٹھکانے لگانا، جدید تہذیب و معاشرت کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا۔ کل کلاں جب پرانی کتابیں، ٹوٹا پھوٹا گھریلو فرنیچر، پرانے کھلونے، از کار رفتہ آلات حرب و ضرب، بے کار تلواریں اور فرسودہ اشیا ہماری پسندیدہ فہرست میں شامل نہ ہوں گی۔ تو کیا خبر پرانی کتابوں کو ٹھکانے لگاتے ہوئے تلوار کو بھی کتابوں کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے۔

ہمارے ترقی یافتہ اذہان میں یہ سوچ سما گئی ہے کہ اب طول طویل جنگوں کا زمانہ اور ضرورت نہیں رہی۔ اب فتح کے جھنڈے نہیں گاڑے جائیں گے۔ پھریرے نہیں لہرائیں گے۔ تلواریں نہیں چمکیں گی۔ کیونکہ قینچی نے حکمتِ عملی سے میدان مار لیا ہے۔ اب فتح و شکست کے فیصلے تلوار کے زور پر نہ ہوں گے بلکہ ہم سب کا مقدر قینچی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ قینچی سرخ فیتا کاٹے گی اور ہزاروں مربع میل کا علاقہ ایک ملک کی ملکیت سے نکل کر دوسرے ملک کی ملکیت قرار پا جائے گا یا پھر مفتوحہ علاقہ بن جائے گا یا پھر آزاد ملک متصور ہوگا۔ قینچی کے ایک ہی حملے میں بڑے بڑے سپہ سالار اوندھے منہ جا گریں گے اس کا تو کسی کو گمان بھی نہیں تھا۔ مگر یہ بات یاد رہے کہ قینچی نے تلوار، ڈھال اور تیر و تبر پر یہ فتح ایک دن میں نہیں پائی۔ انسان کا تلوار پھینکنا، سپر ڈالنا اور قینچی کا تخت پر جلوہ افروز ہونا تاریخ انسانیت کا محیر العقول واقعہ ہے جو صدیوں بعد کہیں جا کر رونما ہوتا ہے۔

بہر حال حسبِ سابق اہلِ مغرب کی جدت پسندی کو مان لیا گیا۔ اہلِ مشرق نے تھوڑی مزاحمت کے بعد اہلِ مغرب کی قینچی پرستی کے سامنے ہتھیار ڈال کر قینچی کی حاکمیت کو تسلیم کر لیا۔ جس طرح کتا شناسی کی ابتدا مغرب سے ہوئی۔ مگر کتوں کو پہلے پہل گھروں کے اندر ہم لائے۔ پلنگوں کی زینت ہم نے بنایا بلکہ اکثر کو تخت پر ہم نے بٹھایا۔ عموماً اہلِ مغرب کسی کام کی ابتدا کے لیے سنگِ بنیاد رکھتے ہیں تو ہم اسے سنگِ فساد کی منزل تک پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے قینچی متعارف کرائی مگر اس کا استعمال محدود رکھا۔ زیادہ کیا تو کسی ریاست کی جڑوں میں قینچی چلاتے رہتے۔ ہم نے جب قینچی کی حکومت کو تسلیم کر لیا تو وفادار غلام کی طرح قینچی کی خدمت میں ہراول دستے کا کردار ادا کرنے لگے۔ یہاں تک کہ قینچی شناسی میں اہلِ مغرب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اوّل اوّل تو ہم قینچی سے جیب تراشی کا کام لیتے رہے مگر آخر کار ہم نے جنم جنم کے سُود و زیاں کے سودے قینچی کے سپرد کر دیے۔ یہاں تک کہ ہمارا ادب، تہذیب اور تنقید تک قینچی مارکہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یعنی ہماری تحقیق، تنقید اور تریمت تک کی پہچان قینچی ہی بنی۔

ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ نظریات و اقدار کی تبدیلی کے ساتھ نئے نئے الفاظ و محاورات اور ضرب الامثال لغت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اہلِ زبان ورطۂ حیرت میں ہیں کہ پہلے شمشیر زن، پنجۂ شمشیر، شمشیر بکف، شمشیر برہنہ، ستہِ شمشیر اور تیغ جگر دار کے الفاظ گونجتے تھے۔ کیونکہ حکومت تلوار کی تھی، اب جب اختیار و اقتدار قینچی کو منتقل ہو چکے تو لغت میں قینچی کے لیے ایسی فراخ دلی نظر کیوں نہیں آتی۔ جیبوں میں قینچی کو قیمتی اثاثہ سمجھ کر چھپائے چھپائے پھرنے والوں کے لیے لغت میں تکریم کا کوئی کلمہ کیوں نظر نہیں آتا۔ یہ لغت کا دیوالیہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔ قینچی اس قدر شان و شوکت کے باوجود ابھی تک

ہمارے ادبی تعصب کا شکار ہے۔ کیا غضب ہے کہ لغت میں قینچی کے حوالے سے ایک دو محاورات کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ بلکہ تریمتوں کی زبان کو مُبتذل جان کر قینچی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ زنانِ بازاری کی زبان کے بارے میں کہا گیا کہ ان کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ قینچی برداروں کے لیے لغت میں جب تک احترام کے لفظ شامل نہیں کر لئے جاتے ہم کسی لغت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہر زبان کی اپنی تہذیب ہوتی ہے اور لفظ تہذیب کے وقار اور تمکنت کی علامت ہوتے ہیں۔ جب تلوار کے لیے لغت میں سینکڑوں الفاظ و محاورات جمع کیے گئے ہیں، یہاں تک کہ تلوار نیام میں ہو گی تو مطلب کچھ اور لکھا ہوا ہے۔ ننگی تلواروں کے لیے مختلف مفہوم لکھا ہے۔ تو پھر ننگی قینچی کے معنی کیوں نہیں لکھے گے۔ لغت میں کہیں بھی درج نہیں کہ قینچی کا منہ اگر کھلا ہوا ہو گا تو اس کا کیا مطلب ہو گا۔ قینچی کے دندان اگر نوکیلے نہ ہوں گے تو اس سے کیا مراد لیا جائے گا۔ قینچی پردے میں ہو گی تو اہل مقراض اس کا کیا مطلب لیں گے اور اگر قینچی عریاں ہو کر میدان میں آئے گی تو اس کا کیا مفہوم ہو گا۔ اس صورتِ حال میں اہلِ قینچی کا یہ مطالبہ کہ نئی لغت ترتیب دی جائے، کچھ بے جا نہیں۔ البتہ قینچی اور اہلِ مقراض کو ایک پیچیدہ مسئلہ درپیش ہے جس کا حل تلاش کیا جا رہا ہے وہ یہ کہ قینچی کی نیام ہی نہیں ہوتی۔ قینچی ہمہ وقت بے نیام رہتی ہے۔ لہٰذا قینچی کو میدان جنگ میں اگلے محاذوں پر بھیجنا خطرے سے خالی نہیں۔

ان تمام مشکلات کے باوجود قینچی کے ارتقا کا سفر مثال ہی نہیں، بے مثال ہے۔ قینچی نے اختیار و اقتدار کی بلند چوٹیاں جتنی جلد سر کی ہیں، شاید انسانی تاریخ میں ایسی دوسری کوئی مثال نہ ملے۔ آج قینچی ایک معمولی اوزار سے جادوئی ہتھیار کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ کہاں وزنی تلوار جسے کڑیل جوان اور جنگ آزما سُورما بھی زیادہ دیر اٹھا کر سنبھال نہیں سکتے تھے۔ اور خاص طور پر جب تک پورا پنجہ قبضۂ تلوار پر نہ رکھا جائے تلوار چلانا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس قینچی کو بڑے، بوڑھے اور بچے بآسانی اٹھا سکتے ہیں۔ قینچی کے ہتھے پر پورا پنجہ ٹکانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ پورے پنجے سے تو پوری قینچی چھپ جائے گی صرف انگلی اور انگوٹھا ہی مطلب براری کے لیے کافی ہیں۔

حالات نے پھر پلٹا کھایا ہے تو قینچی کے نصیب جاگ اٹھے ہیں۔ قینچی کے طلبگاروں اور محبت گزاروں میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ آنے والے زمانوں میں قینچی کو اتنی اہمیت حاصل ہو جائے گی کہ قینچی کو چھو لینا بھی اعزاز سمجھا جائے گا اور فضیلت و افضلیت کے فیصلے قینچی کے پکڑنے اور نہ پکڑنے پر ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ آج بڑے بڑے خاندانی لوگ قینچی کو اپنے خاندانوں کی بقا کے لیے ضروری خیال کرنے لگے ہیں۔ بلکہ اکثر تو اپنے خاندان کو قینچی کی اوٹ میں ساتھ چھپا اور بچا لے جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ تلخ سے تلخ اور کڑوے سے کڑوا مزاج رکھنے والا آدمی بھی قینچی کو ہر شے سے زیادہ مقدم سمجھنے لگا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا زمانہ بھی آئے، جب سرکار دربار میں کرسی نشینوں کی طرح اہم افراد کو قینچیاں الاٹ ہونے لگیں اور ہر ایرے غیرے کے لیے قینچی کا استعمال ممنوع قرار دے دیا جائے۔ یوں بہت سے گدی نشین، اعلیٰ سرکاری افسران، صنعتکار، جاگیردار، منصب دار اپنے لیے قینچیاں الاٹ کرانے کی تگ و دو میں لگ جائیں گے۔

آج کتنے ہی حربی اور مذہبی رہنما، ہر حال میں قینچی سے اپنی جڑت کو مضبوط تر کرتے جا رہے ہیں۔ بدترین حالات میں بھی قینچی کو خود سے جدا نہیں کرتے۔ چاہے انہیں اس تگ و دو میں کتنی ذلت اور توہین برداشت کرنا پڑے۔ اب تو ہمارے رہنماؤں کا قینچی پر انحصار اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ قینچی کے بغیر نہ کسی پروگرام کا افتتاح کرتے ہیں نہ قینچی کے بغیر کسی تقریب کا اختتام ہوتا

ہے۔ مقامِ اطمینان ہے کہ قینچی کی دن رات کی فتوحات نے لغت نگاروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ روز مرہ میں بھی قینچی کا داخلہ بلا روک ٹوک جاری ہے۔ محاورات بھی تخلیق ہو رہے ہیں۔ تراکیب اور استعارات بھی دعویٰ غلامی کر رہے ہیں۔ قینچی طراز، قینچی باز اور قینچی نواز کے الفاظ زبان زدِ عام و خاص ہونے لگے ہیں۔

جھگڑا

جھگڑوں کی ابتدا کب ہوئی یہ قصہ بہت پرانا ہے۔ شاید یہ اس وقت کی بات ہو جب انسان نے تدبر کو امارت کے منصب سے ہٹا کر تکبر کو امیرِ شر بنا کر اسے ہر قسم کے فیصلوں کا اختیار سونپ دیا تو جھگڑوں کی ابتدا ہوئی۔ البتہ جھگڑے کے موضوع پر تاخیر سے قلم اٹھانے کا سبب یہ خوف تھا کہ کہیں کوئی نیا جھگڑا ہی نہ جنم لے لے۔ کہتے ہیں جھگڑا انسان کی قدیم ترین میراث اور مشغلہ ہے۔ جسے انسان نے بخیر وخوبی اب تک سنبھالا ہوا ہے۔ اور میراث و مشغلے سے کون پیار نہیں کرتا؟ کون ہے جو میراث کے لیے سر کٹانے یا سر کاٹنے کو تیار نہیں؟ میراث مذہبی ہو تو لازما" جھگڑا، جنگ و جدل کی شکل میں اپنا وجود منواتا ہے، جھگڑا فکری ہو تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ فکر اور اندیشے سے عاری نسلیں اس قسم کے جھگڑوں سے دور رہتی ہیں۔ جھگڑا علمی یا ادبی ہو تو زبان و بیان کے جوہر دکھانے کے لیے گنوار سے گنوار آدمی بھی جنگ میں کود پڑتا ہے۔ البتہ جھگڑا، گدی نشینی کا ہو تو ہر ایک کے دل میں ایک مرتبہ گدگدی ضرور ہوتی ہے چاہے کچھ ہاتھ آئے یا نہ آئے۔ گوہر مقصود کسی ایک کے حصے میں آتا ہے۔ کتنے ہیں جو موتیوں کی محبت میں ٹھیکریاں چنتے رہے۔ اگر جھگڑا سیاسی ہو تو میدان وسیع ہے، ہر کوئی گھوڑے دوڑا سکتا ہے۔ مشغلہ اور میراث تو ہر کسی کو عزیز ہوتی ہے۔ نہیں چاہتا کہ کوئی اور ڈھول بجائے۔ اگرچہ بہت سوں نے گلے میں ڈھولکیاں ڈال لی ہیں تادادو دہش کے در کھلیں۔ بہر حال میراث وہ ہوتی ہے جو بزرگوں نے اپنی اولادوں کے لیے ترکے میں چھوڑی ہو۔ میراث پر قابض تو ہوا جا سکتا ہے اور گمشدہ میراث کو بعد از تلاش بسیار دریافت بھی کیا جا سکتا ہے، مگر کمایا نہیں جا سکتا۔ صرف مشغلوں میں لٹایا جا سکتا ہے۔

جھگڑا ہی انسان کی وہ واحد میراث ہے، جو ہر قوم تک من وعن اور صحیح و سالم حالت میں پہنچی ہے۔ ورنہ یہاں تو ہر چیز کا حلیہ اور حالت بگڑی ہوئی ملتی ہے۔ صرف جھگڑا اور فتنہ وفساد ہی خالص رہ گئے ہیں، ان میں خیانت کا شبہ کم سے کم ہے۔ ترقی یافتہ قوموں نے نہ صرف اس دولت بے بہا کو دریا برد ہونے سے بچایا ہے بلکہ فراخ دلی سے ہر قوم کی میراث کو اس کے حقیقی وارثوں تک پہنچانے میں مدد دی ہے۔ ترقی یافتہ قوموں کی اسی نیکی اور فیاضی کے نتیجے میں ہر قوم جھگڑنے اور مسلسل فتنہ وفساد کی حالت میں رہنے کے قابل اور خود کفیل ہوئی ہے۔ چنانچہ ہر قوم نے فتنہ وفساد کی میراث بلا روک ٹوک اور جھولیاں بھر بھر کر حاصل کر رکھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کی کوئی مخلوق مسلسل جھگڑوں میں زندہ رہنے کا انسان جیسا حوصلہ نہیں رکھتی۔ علاوہ ازیں دیگر مخلوقات کے پاس جھگڑا کرنے کے وسائل بھی تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اسی لیے وہ صرف موجود کے لیے لڑ سکتی ہیں۔ مفقود کے لیے جھگڑا کرنا اور اسے زیست و زشت کا مسئلہ بنانا صرف انسان کو آتا ہے۔ قصائی اور حلوائی کے ہاں اگر کتوں، بلیوں میں لڑائی ہوتی ہے تو صرف بے کار گوشت، چھیچھڑوں یا لتھڑی ہوئی مٹھائی کے لیے ہوتی ہے۔ بے کار گوشت کے لیے کسی کے منہ سے اگر ہلکی سی بھونک نکل جاتی ہے تو وہ قابل معافی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جانور کوئی قابل ذکر جھگڑا کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ مگر انسان کو جھگڑوں کو خلق کرنے میں جو درک اور اعتماد حاصل ہے اس کے لیے بوٹی، چھیچھڑے یا بے کار گوشت کا ہونا ضروری نہیں۔ بس چیزوں کا خیال اور تصور میں آنا ہی کافی ہے۔ یعنی خود ساختہ و تصوراتی اشیاء کے لیے اگر کوئی جنگ جاری رکھ سکتا ہے تو وہ صرف حضرت انسان ہے۔ جانور اور پرندے ایسی تخلیقی صلاحیتوں سے یکسر محروم ہوتے ہیں۔ کبھی کتے، بلیّاں؛ صفِ

اوّل کا بد معاش، لچا، لچر، لفنگا اور لوفر کہلانے کے شوق میں جوتم جوتا نہیں ہوتے۔ اول تو ان کے پاس جوتا ہی نہیں ہوتا کسی کو جوتے کی نوک پر کیا رکھیں گے۔

قابل اطمینان بات ہے کہ تمام تر سائنسی یلغار بھی انسانی جھگڑوں کی تعمیر و ترسیل کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکی کیونکہ کمزور قوموں نے بھی جھگڑوں کو باقی رکھنے کے لیے اتنا مواد، مسالہ اور میراث جمع کر لی ہے کہ اب انہیں ترقی یافتہ قوموں کی طرف اعانت طلب نگاہوں سے نہیں دیکھنا پڑتا۔ بلکہ کئی غریب ملکوں نے تو جھگڑوں کو بڑھاوا دینے کے لیے ایٹم بم تک بنا لیے ہیں۔ تاکہ وہ جھگڑے بازی میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ آج دنیا کی ترقی پذیر اقوام کم از کم علاقائی اور اندرونی جھگڑوں میں ترقی یافتہ اقوام کو مات دے چکی ہیں۔

ہم دوسروں کا ذکر کیوں کریں جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر رنگ و نسل اور نسب و نیت کے اذہان عطا کیے ہیں۔ یہ ہمارا عزم ہے کہ ہم جدید و قدیم دانش کو بروئے کار لاتے ہوئے جھگڑا سازی کی صنعت میں اپنے آباواجداد کی طرح جھگڑوں کو اصلی حالت میں باقی رکھنے کے لیے کسی قسم کی جانی، مالی اور مثالی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ حاسد قومیں، ہماری علمی، سائنسی، تہذیبی اور معاشی؛ محرومیوں، پستیوں اور بوالعجبیوں کی ایک طویل فہرست گنوا کر ہمارے لیے سبکی اور توہین کا سامان کرتی رہتی ہیں۔ مگر ہمیں اس کی پروا نہیں، ہمارا سر فخر سے بلند ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؛ صاف عیاں ہے کہ جھگڑا اور فساد ہی وہ واحد میدان ہے؛ جس میں آج، ہمارا کوئی مدمقابل نہیں۔ ہماری ہمسایہ قوموں کا دعویٰ ہمسری نہ تو معقول ہے نہ ہی قابل ذکر ہے۔ جھگڑوں کے معاملات میں ہماری لگن اور لیاقت کا یہ عالم ہے کہ ہم جھگڑوں کو ایمان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ ہم ہی ہیں جن کی محنت شاقہ سے جھگڑے نسل در نسل آج تک محفوظ چلے آرہے ہیں۔ بعض جھگڑے تو ایسے بھی ہیں جنہیں ہم نے چودہ صدیوں سے سنبھالا اور پالا ہوا ہے۔ اور دلچسپ امر یہ ہے کہ ہماری تمام تر علمی، ادبی، تاریخی، تہذیبی اور تمدنی ترقی کا حاصل یہی جھگڑا سازی کی صنعت ہے۔ تفصیل میں جانے سے فتنہ و فساد کے مزید در کھل سکتے ہیں۔ جن کا فی الحال بند رہنا ہی بہتر ہوگا۔ جھگڑوں سے ہماری عقیدت مندی اور فسادفی الارض کی صلاحیتوں کی بدولت آج ہمیں ہر قوم رشک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس لمحۂ مسعود تک ہم کتنی ہی مردہ دل، نہتی اور آسودہ پے آرام قوموں کو بیدار و آشنائے فساد کر چکے ہیں۔ یہ اور بات کہ وہی قومیں جو کل تک ہم سے جھگڑا اور جنگل کے قانون و رموز سمجھنے کے لیے زانوئے تلمذ تہ کیے ہوئے تھیں اور دریوزہ گر فساد تھیں؛ آج احسان فراموشی پر تل گئی ہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہم نے جن قوموں کو فساد برائے فساد کے تمام مراحل کی مشق بامشقت کرائی۔ وہی ہم سے داؤ پیچ آزمانے میں مصروف ہیں۔ مگر ہمیں کاہے کا ڈر۔ جب سے احسان فراموش قوموں نے ہم سے مقابلے کی ٹھانی ہے۔ ہم نے بھی شیر کی خالہ کی طرح اپنے تیور اور طریقے بدل لیے ہیں۔ پلک جھپکنے میں طالب فساد کو منزل مطلوب و مشکوک تک یوں پہنچاتے ہیں کہ فسادی سے فسادی اقوام اور نسلیں بھی منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ شکر خدا کہ آج دنیا میں اتنی اقوام، قبائل، زبانیں اور بولیاں نہ ہوں گی؛ اتنے تہوار اور میلے ٹھیلے نہ ہوں گے؛ اتنی یونیورسٹیاں اور تعلیم گاہوں کے شعبے نہ ہوں گے؛ جتنی اقسام اور اہمیت کے جھگڑے دریافت ہو چکے ہیں۔ متمدن دنیا نے تو بات اعدہ معیاری، غیر معیاری، ذاتی، صفاتی، کائناتی، نجی، جماعتی، غیر جماعتی، اجتماعی اور قومی جھگڑوں کو ترتیب و تنظیم تک عطا کر دی ہے۔ اس کار خیر کی انجام دہی پر ہر قوم برابر داد کی مستحق ہے۔ مگر نسوانی، لسانی، مقامی اور ناگہانی جھگڑوں میں ہمیں جو درک اور اعزاز حاصل ہے دنیا کی کوئی قوم ایسا قابل فخر سرمایہ پیش نہیں کر سکتی۔ مجال ہے ہمارے جھگڑوں

میں کہیں کوئی یکسانیت پائی جاتی ہو یا ہمارے جھگڑے یک رخے ہوں یا یک لسانی ہوں یا بوریت کا باعث بنتے ہوں یا ان سے قدامت یا کہولت کی بو آتی ہو یا کسی کی نقالی کا کچھ شائبہ ہو؛ ہرگز نہیں۔ ہمارا ہر فرد جھگڑے کا خالق بھی ہوتا ہے اور خاتم بھی۔ بلکہ ہماری آدھی سے زیادہ آبادی کا روزگار جھگڑوں کی افزائش سے وابستہ ہے۔ البتہ یہ بات تسلیم کرنے میں کچھ عار نہیں کہ بعض افراد اور اقوام غیر معیاری جھگڑوں کے ذریعے آج بھی انسانیت کی توہین کرتی نظر آتی ہیں۔ غیر معیاری جھگڑوں میں کسی تخلیق کار، ادیب و شاعر کا کلام یا پیغام چرا کر، اسے اپنا خیال اور سوال بنا کر پیش کرنا۔ کسی نقاد کا بات بے بات عقل و دانش کے زور اور ضد پر فاد برپا کرنا۔ کسی عورت کا بار بار شوہر کے سامنے سنورنا یا بگڑنا۔ یا پھر اخبار یا رسالے کے مدیر کا کسی مقالہ نگار، افسانہ نگار، غزل گویا نظم گو کا نام اور عنوان بدل کر اپنے نام سے شائع کرنا یا اپنی پسندیدہ شخصیت کے نام سے شائع کرا کر خوشنودی حاصل کرنا۔ کسی نوجوان کا لپ سٹک لگا کر عورت بن کر ناچتے پھرنا یا کسی عورت کا بال کٹوا کر، لپ سٹک لُٹوا کر یعنی نسوانیت گنوا کر مرد و زن میں یکساں چال چلن یا بغیر چال چلن کے پھرنا۔ بچوں کا معصومیت یا نادانی سے مہمانوں کی موجودگی میں پے در پے سچ بولنا۔ کسی اوباش کا بچے کا بستہ اچک لینا، یا راہ گیر کا موٹر سائیکل چھین لینا۔ گھر کے مرد کا گھر کے مرد و زن کے کپڑے دھونے یا نہ دھونے پر ضد کرنا۔ کسی تعلیمی ادارے کے سربراہ کا اساتذہ کو کلاس رومز میں جانے کی ہدایت کرنا۔ یہ سب حرکات انسانی ہیں مگر غیر معیاری جھگڑوں کا باعث بنتی ہیں۔ اس لیے جہاں دیدہ بزرگ ایسے جھگڑوں کو غیر معیاری اور غیر انسانی قرار دیتے ہیں۔

بس ہمیں خوف ہے تو کچھ سر پھرے لوگوں سے، جو مذہب کو تو مانتے ہیں؛ مگر مذہب کے نام پر نہ مرتے ہیں نہ مارتے ہیں۔ اپنی مٹی اور ماحول سے تو پیار کرتے ہیں مگر کسی کی مٹی پلید کرنے کو برا سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ زمین کے ناخدا بن کر ہر مذہب سے مذمت کا پہلو نکال دیتے ہیں اور مدح کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ اس پر مستزاد جھگڑے اور جہالت کی راہ میں ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عجیب لوگ ہیں؛ نہ کسی زبان کی بنیاد پر قومیت کو رواج دیتے ہیں، نہ ہی لسانی بنیادوں پر کچھ کر گزرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ان ظالموں نے تو جانوروں تک کو اپنا دوست بنا رکھا ہے۔ ہر طرح کی تفریق کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ تفریق نہ ہو گی تو توہین و توصیف کے دریک لخت بند ہو جائیں گے۔ ماضی میں جھگڑوں کو بنیاد فراہم کرنے کے لیے پہلے فضا مکدر کی جاتی تھی، پھر بالترتیب توتکار، گالی گلوچ، ہاتھا پائی، مار کٹائی، ڈنڈا سوٹا اور آخر میں کسی ایک آدھ زخمی کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا تھا۔ جھگڑوں کے لیے اتنے اہتمام اور تردد کی ضرورت نہیں رہی۔ جدید ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا بہترین مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔

جھگڑوں میں کامیابی کا انحصار کسی قوم کے تاریخی، تہذیبی، مذہبی اور سماجی پس منظر پر ہے۔ اس ضمن میں مذہبی پیشواؤں اور سیاسی رہنماؤں کے کردار کو نہیں بھلایا جا سکتا۔ کچھ قومیں تو جھگڑوں کا سفر کچھوے کی چال سے صدیوں سے جاری رکھے ہوئے ہیں مگر ان کے منزلِ ضرر تک پہنچنے کے امکان بس امکان تک ہی ہیں۔ کیونکہ ان قوموں کو سردست وکلاء میسر نہیں۔ ان کے مذہبی پیشوا ایک آدھ کے سوا حالت استغراق میں ہیں۔ نہ ہی اخباری کارندے انہیں گلی گلی دستیاب ہیں۔ ایسے میں ان کے مقدر کا فیصلہ بیماری، آزاری ہی کرے گی۔ مذہبی پیشواؤں اور وکلاء سے محروم قومیں اگر کچھ نہیں کر سکتی تو وہ خدائی فوج داروں ہی کی کوئی پلٹن تیار کر لیتیں تاکہ کچھ امید بھی ہوتی۔ جن قوموں میں دین اور بے دین کے مباحث کی ابھی ابتدا ہی نہیں ہوئی وہ قومیں جھگڑوں کو مقام پر اسرار تک کبھی نہ پہنچا پائیں گی۔

آج کمزوروں کے لیے موت مشکل اور زندگی آسان نہیں تو یہ سب فادنی الارض کی صلاحیت کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ جھگڑوں ہی سے انسان نے جانا ہے کہ جھگڑا اگر دوستوں کے درمیان ہو تو نتیجے میں دوست، دشمن کی تمیز بڑھ جاتی ہے؛ اگر جھگڑوں میں اشارے اور کنائے کو اپنایا جائے، تو جھگڑے بات اور بارات کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ انسان جھگڑے ہی سے جاننے لگا ہے کہ جھگڑا پہلے شروع ہوتا ہے اور جھڑکیوں کی نوبت اور ضرورت بعد میں پیش آتی ہے۔ جھگڑا کسی کی ناکامی اور نادانی کو پرکھنے کا کارگر نسخہ ہے۔ جھگڑا کیے بغیر کوئی قومی ہیرو نہیں بن سکتا۔ کوئی ملک امیر اور کوئی بندہ اسیر نہیں ہو سکتا۔ اگر بچہ شرارت نہ کرے تو سمجھ لیجئے بڑا ہو گیا ہے اور بوڑھا اگر جھگڑا نہ کرے تو یقین جانیے وہ زندگی سے مایوس ہو چکا ہے۔

انسان نے ذہن رسا کی بدولت کرۂ ارض پر زندگی کو ہزار ہا زاویے اور زینتیں عطا کی ہیں۔ داد دیجئے کہ انسان جھگڑے کو سات زمینوں سات آسمانوں سے دریافت کی منزل سے گزار کر مقام لاموجود سے ہست و بود تک لے آیا ہے۔

ایک بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جھگڑا چاہے ایک آدمی کرے یا کئی آدمی مل کر فریق مخالف کو ذلت آشنا کریں۔ یہ عمل زمانہ قدیم سے جاری ہے۔ اگرچہ بطور اصطلاح اس کا استعمال اب شروع ہوا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اصطلاح ہمیشہ بعد میں اپنا وجود منواتی ہے پہلے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ ہر جھگڑے کے پس پردہ انا کی آگ ہوتی ہے۔ آگ کا یہ الاؤ مسلسل بھڑکتا رہتا ہے نہ انا کی آگ بجھتی ہے نہ جھگڑے ختم ہوتے ہیں۔

ترقی یافتہ قومیں آج سمندروں کے اندر انسانوں کا سمندر آباد کر رہی ہیں اور خلاؤں کو خیالوں سے جوڑ رہی ہیں۔ مگر انسان کی اصلی زبان اور عملی میدان کو بھلاتی چلی جا رہی ہیں۔ کتنے ہی بادشاہ ایسے گزرے ہیں جو لڑائی جھگڑوں کے اعلیٰ شعور سے نابلد تھے نتیجتاً "باپ دادا کا تخت و تاج اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ آج جان بوجھ کر جھگڑوں کے افادی پہلوؤں پر پردہ اور مٹی ڈالی جا رہی ہے۔ ملمع سازی ہو رہی ہے ورنہ کل کی طرح آج بھی جھگڑوں کی ضرورت ہے جو قومیں اندرونی اور بیرونی محاذوں پر جھگڑوں اور عناد کا قابل ذکر ذخیرہ نہیں رکھتیں وہ نہ تو میڈیا کی زینت بنتی ہیں اور نہ ہی اقوام عالم میں شہرت کی حقدار ٹھہرتی ہیں۔ گم نامی ایسی قوموں کا مقدر بنتی ہے اور گمنامی آخر بدنامی ہی تو ہوتی ہے۔ جھگڑوں سے وابستہ لوگ ہی بہترین فنکار ہوتے ہیں یہی لوگ بہتر جانتے ہیں کہ جھگڑے میں دو ہتھڑ جڑنے کا موقع کون سا ہوتا ہے۔ آواز کے زیر و بم سے مخالف کو تگنی کا ناچ کیسے نچایا جاتا ہے۔ ہجو ملیح کے موقع پر الفاظ اور چہرے کے نقوش کو کیسے ڈھالنا ہے۔ ہاتھوں کو کتنا بلند اور ٹانگوں پر کتنا دباؤ بڑھانا ہے یا فریق مخالف کو مغلظات سے ادھ مُوا کیسے کیا جاتا ہے۔ لائق صد تحسین ہیں وہ خواتین جو جھگڑوں کی پرورش اولاد نرینہ کی طرح کرتی ہیں اور خالص جھگڑوں سے جی بہلاتی ہیں۔ کسی کو پتھر، کسی کو تھپڑ، کسی کو گالی، کسی سے چونچا لی سب کچھ انہوں نے ہی برقرار رکھا ہوا ہے۔ جھگڑے نہ ہوتے تو دنیا بھر کی زبانوں کے سوتے دریائے خشک کی مانند خشک ہو چکے ہوتے۔ آج بھی گھر میں بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، سڑک پر سنجیدہ ، گھر میں رنجیدہ، دوست کا بھرم، ہمائے کا دھرم، ہمیشہ پیش نظر؛ جانوروں سے پیار، دماغ پر کوئی نہ کوئی دھن سوار؛ جیسے نسخے آزمائے جا رہے ہوتے۔

کتا اور گدھا

کتا کیوں پیدا کیا گیا؟ گدھے کی تخلیق کا آخر کیا مقصد تھا؟ کتا پہلے وجود میں آیا یا گدھا کرۂ ارض پر پہلے رونق افروز ہوا؟ ایسے بہت سے سوالات کا جواب ابھی باقی ہے۔ ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے، اس لیے بھی کہ ان کی تخلیق کے وقت ہم موجود نہ تھے۔ بالفرض ہم موجود بھی ہوتے تو ہمیں کیا معلوم تھا کہ آنے والے زمانوں میں کتے اور گدھے اس قدر اہمیت اور عزت حاصل کر لیں گے۔ یوں بھی ہم سادہ لوح انسان اس طرح کے دقیق مسائل پر رائے زنی سے گھبراتے ہیں۔ البتہ کتوں اور گدھوں کی تخلیق کے متعلق ہمارے فلسفی دماغوں نے ضرور بحث کی ہو گی۔ بحث کے دوران یہ سوال بھی ضرور پیدا ہوا ہو گا کہ کتے کو آخر کتا کیوں کہا جاتا ہے، گدھا کیوں نہیں کہا جاتا؟ کتا بھی تو برفانی علاقوں میں باربرداری کے کام آتا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ کتا کسی صورت میں گدھا بننا گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے کتے کو اس کے حال پر چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا گیا ہو گا۔ ورنہ ابتدائی زمانے میں جب ذہن اور علوم نے اتنی ترقی نہ کی تھی تو مخلوق کو کوئی بھی نام دینے میں کیا مشکل تھی۔ بس انسان نے ویسے ہی غرور و تکبر سے کام لیتے ہوئے کسی کو گدھا اور کسی کو کتا کہہ دیا ہو گا۔ گدھے کو ہی بے وقوف کیوں کہا جاتا ہے، گدھا وفادار کیوں نہیں کہلاتا؟ ہو سکتا ہے گدھے کو انسانوں اور حیوانوں کا بوجھ اُٹھانے کے سبب سے بے وقوف قرار دے دیا گیا ہو۔ یا پھر یہ ہے کہ مسلسل خاموش رہنے کی وجہ سے اور احتجاج پر آمادہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی اسے گدھا سمجھ لیا گیا ہو۔ بہر حال یہ وہ سوالات ہیں جو ہمارے فلسفیوں کو زچ کرتے رہے ہوں گے۔ آخر تنگ آ کر فلسفیوں نے کتے اور گدھے کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا گیا ہو گا۔ اور کائنات کی تخلیق کے اسباب پر غور شروع کر دیا ہو گا۔ یوں ان چیزوں کے وجود کا راز تلاش کرنے میں کوشاں رہے ہوں گے جو ان کے لیے ہمیشہ سوہانِ روح رہیں اور جب کچھ نہ بن پڑا ہو گا تو تھک ہار کر چپ ہو گئے ہوں گے۔

بات کتے اور گدھے کی ہو رہی تھی کہ ہم کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ کسی کو کچھ خیال نہیں کہ کتے اور گدھے کی ضروریات اور مشکلات کیا ہیں؟ یہی نہیں ان کی عادات و خصائل کو جاننے کی بھی کوشش نہیں کی جاتی۔ دونوں کے طور طریقوں کا سرسری سا جائزہ لینے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ دونوں دھرم کے پکّے ہیں۔ کسی انسان کے بارے میں تو یہ بات باآسانی کہی جا سکتی ہے کہ اس میں انسانیت نام کو نہیں، یہ انسانیت کے نام پر دھبہ ہے یا انسانیت کا اس سے کیا لینا دینا یا اس نے اپنی حرکتوں سے انسانیت کا جنازہ نکال دیا ہے یا یہ انسان نہیں حیوان ہے۔ مگر کسی کتے کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں کتے میں کتا پن نہیں پایا جاتا؛ یا کتا پن کا فقدان ہے۔ پھر آپ گدھے کی مثال لے لیجیے، لاکھ کوشش کیجیے کہ گدھا گدھوں جیسی حرکتیں نہ کرے مگر باز نہیں آتا۔ ہمیشہ گدھے پن میں ہی بڑائی محسوس کرتا ہے۔ صرف ابنِ آدم ہی ہے جو انسان سے حیوان تک کا سفر پلک جھپکتے میں طے کر لیتا ہے۔ کتے اور گدھے کے مزاج میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ غور کیجیے! کتے اور گدھے کی فریاد میں کتنا فرق ہے۔ کتا مذاق میں بھی بھونک رہا ہو تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گدھا سچ مچ میں بھی رو رہا ہو تو کوئی پروا نہیں کرتا۔ کہاں کتا اور کہاں گدھا؟ اسی لیے دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی فریاد کو آہ بنانے کے لیے کتا بننا پسند کرتے ہیں؛ گدھا بننے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔

کتا خارجی عوامل کی تحریک کے بغیر منہ سے ایک بھونک بھی نہیں نکال سکتا۔ کتے کی طبیعت میں خارجیت کا عنصر جس حد تک غالب ہے اس کا احساس اب تک بہت کم لوگوں کو ہوا ہے۔ کتے کے ہر عمل پر آورد کا گمان ہوتا ہے۔ بات

مثال سے آسان ہو جائے گی۔ جب تک کوئی کتے کے قریب سے نہ گزرے، کتے کو ششکار کر اس کے جذبات کو انگیخت نہ کرے اس کی چچوڑی ہوئی ہڈی چھیننے کی کوشش نہ کرے، اس کے علاقے میں غاصبانہ گھس نہ آئے۔ عموماً کتا کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ نیم غنودگی کے عالم میں سویا رہتا ہے یا چپ رہتا ہے۔ مگر جونہی کسی نے کتے کی دم دبانے کی کوشش کی، کتا تمام اُصولوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ ثابت ہوا کتے کے بھونکنے کے عمل میں سوچ و فکر کے عنصر کا عمل دخل کم اور خارجیت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ گدھے کی بات ہی اور ہے، گدھا جس قدر خاموش طبع ہے، اسی قدر داخلیت پسند ہے۔ ارد گرد جو کچھ ہوتا رہے، گدھا بظاہر اس سے بے نیاز رہتا ہے۔ دل پر سارے صدمے سہتا ہے۔ آپ لاکھ ظلم کریں، ڈنڈے برسائیں، پتھر ماریں، اُف تک نہ کرے گا، صبر کا دامن نہ چھوڑے گا، سب کچھ حوصلے اور بہادری سے برداشت کرے گا۔ اس کے برعکس کہاں تھڑدل کتا؛ ذرا کسی نے کنکر اٹھایا، اِدھر اس نے ٹیوں ٹیوں شروع کر دی، نہیں تو ڈرانے لگا، دھمکانے لگا۔ کتا بڑا اشکی مزاج ہوتا ہے۔ ذرا سی بھنک پڑنے پر میدان جنگ سے گھر کی راہ لیتا ہے۔ اسے بزدلی کے علاوہ آپ کیا نام دیں گے۔ گدھے سے زیادہ بہادر کون ہوگا ایٹم بم سامنے رکھ دیجیے، روندتا ہوا گزر جائے گا۔ اوا کس طیارے سر سے گزر جائیں، گدھے کے کان پر جوں بھی نہیں رینگے گی، مچھر گزر گیا یا مکھی۔ حتٰی کہ گدھا امریکہ تک سے خوف نہیں کھاتا۔ سمجھ نہیں آتا کہ اب تک گدھے کو بہادری کا تمغہ کیوں نہیں دیا گیا۔

گدھے کی داخلیت پسندی سے ہم خواہ مخواہ امریکہ بہادر تک جا پہنچے۔ گدھے کی مستقل مزاجی، ثابت قدمی اور بردباری دیکھیے کہ خارجی عوامل اس پر اثر انداز ہی نہیں ہوتے۔ خارجی سے اور کچھ مراد نہ لے لیجئے گا، مراد خارجی ہی ہے۔ گدھا دوسروں کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتا۔ بلکہ اکثر اوقات اپنے معاملات اوروں کے سپرد کر دیتا ہے۔ مالک اور مالکن کی لڑائی میں قطعاً دخیل نہیں ہوتا۔ کتا ہے کہ ہر دو کی لڑائی میں میم صاحبہ کی طرف داری پر اُتر آتا ہے۔ مالک کی منّت سماجت کرنے لگتا ہے۔ کبھی اپنی بات منوانے میں کامیاب اور کبھی اپنی اس عادتِ بد کی بدولت مالک کے ہاتھوں خوب پٹتا ہے۔ اِدھر بلی اور مرغی میں کسی بات پر تکرار ہوئی، اُدھر کتا درمیان میں آن ٹپکا۔ گیدڑ کو دیکھا تو اس کے پیچھے ہو لیا۔ پوری پلاٹون جمع کر لی۔ کسی چور اُچکے کو دیکھا تو اس سے جھگڑا مول لے بیٹھا۔ اپنی انہی عادات کی وجہ سے کتا اپنا اعتبار کھو بیٹھا ہے۔ کوئی فرد اور جانور کتے پر اعتبار نہیں کرتا۔ گدھا ہے کہ جہاں چلا جائے کسی کو کچھ خوف نہیں۔

گدھے کا خاموش طبع ہونا اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ مگر سچی بات تسلیم کرنے میں ہی بڑائی اور عظمت ہے۔ گدھا سچ اور جھوٹ کے فلسفے سے بالکل واقف نہیں اور نہ ہی میرؔ و غالبؔ کے داخلی جذبوں سے بھرپور اشعار گدھے کی سمجھ میں آتے ہیں۔ مگر گدھا اپنے طرزِ عمل سے خود کو پڑھا لکھا، بردبار اور دانش ور ثابت کرتا ہے۔ کتا ہے کہ اس کا ہر عمل اسے جھگڑالو، گنوار اور جاہل ثابت کر رہا ہے۔ گدھا اوچھی اور غیر ذمہ دارانہ حرکتیں نہیں کرتا۔ آتے جاتے مہمانوں کو نہ گھورتا ہے، نہ غور سے دیکھتا ہے، نہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے؛ بلکہ سر جھکا کر آداب کہتا ہے، اظہارِ پیار و محبت کرتا ہے، کوئی نہ سمجھے تو اس میں گدھے کا کیا قصور؟ اس کے برعکس کتے کی حرکتوں کا جائزہ لو؛ توکتے سے زیادہ بے حیا، مکار اور بے اعتبار کوئی نہیں۔ سب کو ڈراتا ہے، دھمکاتا ہے اور گھورتا بھی ہے۔ تازہ گوشت اور نئے مہمانوں کو للچائی نظروں سے دیکھنے سے باز نہیں آتا۔ عجیب وفاداری ہے اگر یہی وفاداری ہے تو غداری کسے کہتے ہیں؟ ہم بھی بہت ضدی قسم کے ہیں۔ کتے کی بجائے گدھا کیوں نہیں پال لیتے؟ سنتری کے فرائض گدھے کو کیوں نہیں سونپ دیتے؟ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اب تک ہمارے ہاں پالتو گدھے کی اصطلاح بھی رائج نہیں ہو سکی۔ شاید

ہمیں مغربی دانشوروں کے سرٹیفکیٹ کا انتظار ہے۔ لو! اب تو مغرب نے بھی گواہی دے دی ہے کہ گدھا مصلحت اندیشی میں کسی دانشور سے کم نہیں۔ جس کے ہر فعل میں آمد ہی آمد ہے اور جس میں آورد کا شائبہ تک نہیں۔

ہم لکیر کے فقیر نہیں تو اور کیا۔ اب تک کتے سے صرف حفاظت اور سراغ رسانی کا کام لیا جا رہا ہے اور گدھے کی ذمہ داری بوجھ ڈھونے سے زیادہ نہیں بڑھ سکی۔ مغرب کو دیکھو! گدھے اور کتے سے وہ وہ کام لیے جا رہے ہیں کہ یہاں جن کا تصور بھی محال ہے۔ گھر کی تقریباً تمام ذمہ داریاں ان دو میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں مرد آزاد پھرتے ہیں۔ یہاں تو ابھی تک گدھے کے صحیح مقام کو پرکھا اور پہچانا ہی نہیں گیا۔

مایوسی گناہ ہے وہ وقت دور نہیں جب غفلت کا پردہ ہٹے گا تو کتے اور گدھے کو اہم ذمہ داریاں سونپی جائیں گی۔ مثلاً" کتے کی ذمہ داریاں یہ ہوں گی۔ بازار سے سودا سلف لانے کے لیے کتا چھوٹے سے سائیکل پر پیڈل مارتا ہوا جائے گا، کتا اگر امیر کا ہوا تو گاڑی پر سیر کرتا ہوا جائے گا۔ سیلز مینوں اور سیلز وومینوں سے رعایت کا طلبگار بھی کتا ہی ہوگا۔ چھوٹے بچوں کو فیڈر سے دودھ پلانے کی ذمہ داری بھی کتے کی ہوگی۔ کھلائی کے فرائض بھی کتا ہی انجام دے گا اور اپنی ملائم بھونک سے بچے کو لوری دے کر اپنے ساتھ سلائے گا۔ سالن کی ہنڈیا پکانے کے لیے سٹول پر چڑھ بیٹھے گا۔ گھر کے جھوٹے برتن وہی مانجھے گا۔ مختلف پبلک مقامات پر اُمور خانہ داری اور کتوں کے فرائض کے موضوع پر جدید نسل کے کتوں کو لیکچر بھی وہی دے گا۔ نہ جانے کیا کچھ کرے گا اور کر رہا ہے۔ جس کے بارے میں ہم جاننا ضروری نہیں سمجھتے۔ سڑکوں، گلیوں اور گٹروں کی صفائی گدھے کے سپرد ہوگی۔

وہ وقت دور نہیں جب ہم سب کتوں کی افادیت و اہمیت کے دل و جان سے قائل ہو جائیں گے۔ تو یقیناً ایسے مرحلے پر سب اتفاق کریں گے کہ قیمتی جہیز کے ساتھ دلہن کو ایک عدد کتا بھی دیا جائے یا پھر لڑکے والے جہیز کے ساتھ کتا بھی ضرور طلب کریں گے۔ تاکہ دلہن اجنبیت کا شکار نہ ہو۔ یوں گدھا دلہن کے آگے آگے اور کتا پیچھے پیچھے ہوگا۔ دلہن کو منہ دکھائی میں نقدی نہیں دی جائے گی بلکہ چھوٹے چھوٹے پلے سلامی میں دیے جائیں گے۔

عقلمند تجارت کو معاش کا ذریعہ بناتے ہیں۔ کتوں اور گدھوں کی مانگ بڑھتی دیکھ کر تاجر پیشہ اور کاروباری طبقہ یہ میدان بھی مار لینے میں کوشاں ہوگا۔ یوں کتا بازار اور گدھا بازار آناً فاناً وجود میں آجائیں گے۔ جن کاروباری حضرات کو بازار میں کاروبار کے لیے مناسب جگہ نہیں ملے گی وہ گھروں کو ہی کتا ہاؤس، گدھا ہاؤس قرار دے دیں گے۔ کون کہہ سکتا ہے ایسے ماحول میں کتوں اور گدھوں کو سرکاری ڈیوٹیاں نہیں سونپی جائیں گی۔ نہ صرف سرکاری اداروں میں ان کی کھپت بڑھ جائے گی، بلکہ نجی ادارے بھی سرکاری اداروں کی دیکھا دیکھی کتوں اور گدھوں کو اپنے اداروں میں مختلف اہم مناصب برفائز کر دیں گے۔ بس اسی قدر لکھ پایا تھا کہ خیال سے سوال ٹکرایا۔ تو خیال نے یوں ہم کلامی کی بس یہی دن ہم آزاد بندوں پر بھاری ہوں گے۔ تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب گدھا سنتری کے فرائض کو سنبھال لے گا مگر وہ رشوت اور غفلت کی لَہجَد سے بھی واقف نہ ہوگا۔ اُونچے محلات اور بینک بیلنس کا تصور اس کے لیے بے معنی ہوگا۔ تو ہمارا کیا بنے گا۔ چشمِ تصور سے دیکھو! کتا دکان پر اشیائے صرف بیچ رہا ہے اور کم تولنے کا ڈھنگ اُسے نہیں آتا، ہیرا پھیری کر کے وہ کیا کرے گا۔ یہ سب کچھ نہ ہوگا تو ہم کیوں کر زندہ رہیں گے۔ یا پھر کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ کتے اور گدھے کے چیلن بھی ہم انسانوں جیسے ہو جائیں گے بس ان باتوں سے خوف آتا ہے کہ کتا کتا نہ رہے گا اور گدھا گدھا نہ رہے گا۔

بغلول

بغلول کے حوالے سے یہ بحث اب تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی کہ بغلول صرف شکل وصورت کے اعتبار سے بغلول ہوتا ہے یا کسی کو بغلول بنانے میں کسی طالع آزما کا کوئی کردار ہوتا ہے۔ پھر یہ سوال بھی تو ابھی تک باقی ہے کہ آخر صرف انسان ہی بغلول کیوں ہوتے ہیں؟ جانوروں اور پرندوں میں بغلول کیوں نہیں ہوتے؟ اس طرح کے مباحث سے تحقیق و تشویش کے دروازے تو کھل جاتے ہیں مگر جب سے تحقیق وتصدیق کو ہماری زندگیوں میں بنیادی یا اعتقادی حیثیت حاصل ہوئی ہے، بہت سی تسلیم شدہ حقیقتیں بھی انکار، افکار اور للکار کی زد میں آگئی ہیں۔ مثلاً تحقیق نے ہی ہم پر یہ بھید آشکار کیا ہے کہ ابتدا میں انسان، جانوروں کا جانور ہوتا تھا۔ ورنہ ہم تو ابنِ آدم کو ہمیشہ انسان ہی سمجھتے رہتے۔ علمائے بشریات کا کہنا ہے کہ کہیں بہت بعد میں اس بوزنے کو شوق چرّایا تو آدم صورت نظر آیا۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ اس عظیم جانور کو یعنی جس نے آئندہ زمانوں میں کبھی انسان اور کبھی بغلول کہلانا تھا، کسی کمتر درجے کے جانور نے مشورہ دیا ہوگا کہ تم سیدھے کیوں نہیں کھڑے ہو جاتے، ہاتھوں سے ٹانگوں اور ٹانگوں سے ہاتھوں کا کام کیوں لیتے ہو۔ میری مانو اور سیدھے ہو کر سینہ سپر ہو جاؤ ورنہ قیامت تک جانور ہی بنے رہو گے۔ کوئی ایسا باعثِ بخت لمحہ تھا کہ مشورہ قبولِ خاطر ہوا اور ابنِ آدم، جانور کی جون سے انسانی وضع قطع اختیار کرنے پر راضی ہو گیا۔ مگر اِس کا کیا کیا جائے کہ صدیوں کی چوپائیوں جیسی عادات اسے جلد جھکنے اور جانور بننے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ویسے بھی سیدھا کھڑا رہنا ہر کسی کا مقصد اور مقدر نہیں ہوتا۔

سب جانوروں اور اہلِ زمیں کو خدا کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے کہ اس عظیم مخلوق یعنی ابنِ آدم نے انسان ہونا منظور کر لیا ورنہ اس بات کا امکان تھا اور رہے گا کہ یہ عظیم مخلوق (انسان) کسی بھی لمحے پھر کر جانور بن سکتی ہے۔ کمزور جانور کو دبوچ سکتی ہے۔ اس وقت دولتی جھاڑ سکتا تھا تو اب دو چار ہتھڑ جڑ سکتا ہے۔ مشورہ پس پشت ڈال کر آپ کی جان کا دشمن ہو سکتا تھا اور ایمان کا بھی۔ مگر خوب یاد آیا، ایمان تو ابھی دونوں جانوروں کے پاس تھا ہی نہیں۔ یعنی ابنِ آدم ابھی بغلول کا بغلول تھا۔ ایمان و انصاف کی تفریق و توفیق کا تو اُسے ابھی موقع ہی نہ ملا تھا۔ ورنہ، ایمان تو ہر بشر کو عزیز ہوتا ہے، چاہے کوئی بے دین اور بے ایمان ہی کیوں نہ ہو۔ جھوٹ، دھوکہ، جعل سازی، چوری چکاری، ڈاکہ زنی، راہزنی، قتل وغارت گری کا عادی ہونا اپنی جگہ پر مگر جب بات ایمان کی ہو تو ایمان اور انعام کی کسے فکر نہیں ہوتی۔ یہ ایمان وانعام ہی تو ہیں، جس کے باعث اکثر دوستیاں دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کوئی بغلول ہی ہوگا جو ایمان بچانے کے لیے سینہ سپر نہ ہوتا ہوگا۔ بات ایمان کی ہو رہی ہے۔ خدا لگتی کہنی چاہیے، حق تو یہ ہے کہ عظیم جانور سے انسان بننے کا فیصلہ جلد بازی میں سرزد ہوا؛ ورنہ ابنِ آدم پلٹ پلٹ کر اپنی پہلی حالت کو رشک کی نگاہ سے نہ دیکھتا۔

بات تحقیق سے شروع ہوئی تھی۔ علمائے بشریات بھی کیسے کیسے مسائل کو چھیڑ بیٹھتے ہیں کہ خود ان کی تحقیق کی کشتی ہچکولے کھانے لگتی ہے، انہوں نے ہی تو ہماری تاریخ اور تربیت کے تذکرۂ قدیم کو قدیم ترسے یوں جوڑا ہے کہ ہمارا کل اور گزشتہ کل تفریق اور تشکیک کے بھنور سے باہر نہیں نکل پا رہے۔ ان کا خیال ہے کہ ابتدا میں انسان اپنی عادات واطوار سے جانور کم اور انسان زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ مگر بتدریج ترازو کا بایاں پلڑا زیادہ وزنی ہونے لگا۔ یعنی ہر انسان کے اندر ایک جانور پلنے لگا جو انسان کی پہچان کی ہر شے کو چٹ کرتا گیا۔ علمائے بشریات کی اس تحقیق و تشکیک کا لازمی نتیجہ تقسیم و تردید کی صورت میں نکلا۔ تفہیم کا منہ دیکھنا کسی کسی کو نصیب

ہوتا ہے۔ بس اسی تحقیق کا کیا دھرا ہے کہ علمائے بشریات نے یہ اعلان عام کیا کہ کوئی باہوش معاشرہ بغلول کے بغیر نشوونما نہیں پاسکتا۔ ہمیں ان علما کا شکر گزار ہونا چاہیے جن کی کوشش و کاہش سے بغلول کے معنی و موضوع سے پردہ ہٹا۔

ورنہ بغلول کا موضوع بظاہر کوئی ایسا موضوع نہیں تھا جس کی ثقاہت، ثقافت یا ثقالت کے پیش نظر کوئی صاحبِ نظر پہلی ہی فرصت میں بغلول کے موضوع، مرتبے، منصب اور مراعات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا اور تحقیق کے زور پر بغلول کو تاریخ کی تدلیس و تلبیس سے نکال کر تشخیص و تصدیق کے روشن رستے پر لا کھڑا کرتا۔ اگر نامعلوم زمانے سے لے کر اب تک بغلول کی اہمیت اور ضرورت سے بے اعتنائی برتی گئی ہے تو اس میں ہمارے محققین کا کچھ قصور نہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں زمانۂ قدیم سے دستور چلا آرہا ہے کہ جب تک کوئی واقعہ، حادثہ یا سانحہ بن کر خواص کے ہاتھوں سے نکل کر عوام کے دماغ کو مختل اور دل کو ارزل نہ کر دے، ہماری توجہ کا مستحق ہی نہیں ٹھہرتا۔ یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ بغلولوں کی کوئی تہذیب کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ نہ صراطِ دوستی نظر آتا ہے، نہ ہی صراطِ دشمنی کا سِرا ملتا ہے۔ بغلول کی کوئی قوم اور قبیلہ بھی تو نہیں اور بغلول ہونا کوئی دنیاوی منصب اور پیشہ بھی نہیں۔ بغلول دنیا کا واحد ایسا متنفس ہے جو اپنی پہچان کے لیے معروف، مستند اور معیاری وسیلوں سے تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ لے دے کے ہمارے محققین سے دو چار جملے ہی برآمد ہو سکے ہیں۔ مثلاً: بغلول کہیں کا، بغلول یہیں کہیں کا اور بغلول کہیں کہیں تھا۔ بھلا ہو علمائے بشریات کا، جن کی محنت کے سبب سے ہم بغلول کی حقیقت کو جاننے کے قائل اور قابل ہوئے ہیں ورنہ ہر عہد کا اور ہر عہدے کا بغلول پردۂ اخفا ہی میں رہتا اور بہت سے بغلول تو خود بھی اس حقیقت سے لاعلم ہی رہتے کہ وہ بڑے پائے اور مرتبے کے بغلول ہیں۔ کتنے ہی بغلول خود کو پہچانے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے اور انہیں خبر تک نہ ہوئی، وہ ساری زندگی بغلول کے بغلول ہی رہے۔ پائے کے بغلول کا پتہ چلا لینا اگر آسان ہوتا تو ہر بڑا آدمی اپنے دائیں بائیں ایک دو بغلول ضرور رکھتا۔

چنانچہ روزِ اوّل سے لے کر تا ایں دم کوئی بغلول یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ بغلول ہے یا کسی حد تک بغلول ہے۔ مثال کے لیے آپ خود کو دیکھیں یا ارد گرد نگاہ دوڑائیں ہر کوئی گھبرا کر چُپ سادھ لے گا حالانکہ ہمارے دانشوروں نے تو اپنی زندگی، ظرف اور ذلت کو دیکھ کر یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ ہر آدمی کچھ نہ کچھ بغلول ضرور ہوتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی خدا پرست یا زر پرست کیوں نہ ہو۔

ہر بغلول کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ لوگ احمق کو تو معاف کر سکتے ہیں اور احمق سے ہمدردانہ برتاؤ کا سوچ سکتے ہیں، اور عموماً احمقوں کی ضروریات اور عادات کا خیال بھی رکھتے ہیں اور رکھتے رہیں گے مگر کوئی کسی بغلول کو مناسب یا نامناسب رعایت دینے کو تیار نہیں۔ اُلٹا ہر محفل کو ایک سجے سجائے بغلول کی ہمہ وقت تلاش ہوتی ہے۔ چاہے وہ سیاسی زعما کا گروہ ہو، اہلِ علم کی مکالماتی گفتگو ہو، اہلِ دول کا ظہرانہ ہو یا اہلِ حسن و عشق کا مے خانہ ہو، سب کو شکار کی تلاش ہوتی ہے۔ جیسے ہی کوئی چالاکی، عیاری، مکاری سے عاری، زمانہ سازی کے تند و کُند ہتھیاروں سے نہتا دکھائی دیتا ہے؛ جیسے ہی کوئی مال، دولت، اولاد، افعال و اشغال اور حواس و لباس کے بل پر کسی کی توہین و تردید کرنے سے معذور نظر آیا؛ سمجھ لیا جاتا ہے، ہو نہ ہو بغلول ہے۔ بس پھر سب بھوکے بھیڑیے اس مینے کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں۔

اتنی بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ بغلول چاہے کسی ملک، مذہب اور ماحول کا ہو، بے ضرر ہوتا ہے۔ آپ اسے پل بھر میں شاعر بنا دیں، ادیب بنا دیں، نقیب بنا دیں، جو چاہیں بنا دیں، آسانی سے بن جائے گا۔ بھائی بنائیں یا اُلٹا لٹکائیں، اُف

نہیں کرے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ طبیعت کی سادگی اور نیت کی سچائی کی بدولت یہ لوگ، کم ظرف اہلِ دنیا کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہوتے ہیں اور اکثر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بلا عذر اور بلا قیمت منتقل ہوتے جاتے ہیں اور آخر کوئی طالع آزما ان ہیروں کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

ہاں! آپ بغلول کی اگر قطعی پہچان چاہتے ہیں تو افواہ سازوں کے پاس قطعی اور قابلِ یقین معلومات ہوتی ہیں۔ افواہ سازوں کے رہنما کا کہنا ہے کہ بغلول پرندوں کی طرح صبح کا اخبار نہیں پڑھتے۔ رات کی گالم گلوچ اور دن کی دہشت ناکی پر کان نہیں دھرتے۔ بغلول رہنمایانِ فرسودہ طبع کی طرح نہ تو آرزوؤں، اُمنگوں اور اُمیدوں سے یکسر محروم ہوتا ہے اور نہ کسی کو محروم کرتا ہے۔ کہتے ہیں سب کے سب بغلول ایک ہی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں ورنہ دنیا میں انسان تو ذہن و ذکاوت اور ظرف و ظرافت سے انفرادیت قائم کرتے ہیں۔ افواہ سازوں کا آزمودہ اعلامیہ ہے کہ کوئی بغلول اعتراض کے لیے حجتن نہیں کرتا۔ مصلحت کوشی میں بھی کورا ہوتا ہے۔ نہ افسوس کے موقع پر اظہارِ افسوس کرتا ہے، نہ افسردگی کے موقع پر افسردہ ہوتا ہے۔ نہ بناوٹ، نہ لگاوٹ، بس اپنی دُھن میں مگن۔ وہ نفع و نقصان کو ترازو میں تولنے کا قائل نہیں ہوتا اور نہ ہی ترازو لیے لیے پھرتا ہے۔ بغلول، سوچ سوچ کر ہلکان نہیں ہوتا، نہ اپنے بارے میں، نہ دوسروں کے بارے میں۔ زمانہ اسے بغلول نہ کہے تو کیا کہے۔

اوّل اوّل تو کھیل کُود میں مست رہنے والے کھلنڈرے ہی بڑے بوڑھوں کی نگاہ میں بغلول سمجھے جاتے تھے۔ مگر یہ بغلول جلد ہی اوّلیت کا یہ اعزاز گنوا بیٹھے۔ جب کھیل ہی کھیل میں لاکھوں کروڑوں کمانے اور اُڑانے لگے۔ پھر یوں ہوا کہ بغلول سے ابوالہول بن بیٹھے۔ کسے خبر تھی کہ کل کے بغلول آج کے منگول ثابت ہوں گے۔ بغلول اور ابوالہول کی بحث نئی بھی ہے اور پرانی بھی۔ اس بحث نے اقوامِ عالم سے بغلول چھین لیا ہے اور آپ تو جانتے ہی ہیں، بحث کے پاؤں تو ہوتے ہیں، سر نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس بے سمت و بے دلیل سفر سے گریز ہی بہتر ہے ورنہ کل کا بغلول آج کا منگول کچھ کم فسق و فساد نہیں۔

ایک وہ وقت تھا جب میراثی، بھانڈ، مقامی شاعر، شرارتی پرچہ نویس اور اول فول بکنے والے بغلول کہلاتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ضرر رساں نہ تھا، بس تضیعِ اوقات کی ذیل میں آتے تھے۔ ہر کہیں بغلول نظر نہیں آتے تھے۔ خال خال لوگ خال خال لوگوں کے لیے بغلول ہوتے تھے۔ مگر آج صورتِ حال یکسر مختلف ہے۔ ہماری زمین بغلولوں سے بھر چکی ہے۔ آج ہر آدمی کا ہر عمل دوسرے کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے۔ اہلِ مغرب ہمیں اور ہم انہیں بغلول سمجھتے ہیں۔ اہلِ عرب؛ ایشیا اور افریقہ والوں کو اور ہم عربوں کو بغلول گردانتے ہیں۔ یوں دنیا میں اب کوئی فرد، قوم اور قبیلہ ایسا نہیں جو بغلول شمار نہ ہوتا ہو۔

خواب اور خواہشیں

یہ دنیا خوشنما خوابوں کا گھر ہے جس میں ہر آدمی اپنی بساط کے مطابق خوابوں کا حسین جزیرہ آباد کر لیتا ہے۔ مگر اکثر ایسے حسین جزیروں کو خواہشات کی بپھری ہوئی موجیں غرق کر دیتی ہیں۔ خوابوں سے انسان کے پیار کا یہ رشتہ زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ماضی میں عموماً راتیں خوابوں کے لیے مختص ہوتی تھیں۔ مگر افسوس! اب خواب ماضی جیسے رنگین اور رعنا نہیں رہے۔ اس سے زیادہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ ہر قابل قدر چیز جو روح کی تسکین کا باعث ہوا کرتی تھی ایک ایک کر کے ہمارے حافظے اور معاشرے سے رخصت ہوتی چلی جارہی ہے۔ کیونکہ جب سے خواب گاہیں آماجگاہیں بنی ہیں؛ راتیں واردات کے لیے یا متفرقات کے لیے مخصوص ہو گئی ہیں۔ خواب گاہوں میں اجنبی مہمانوں کے بسیروں نے راتوں کو خوابوں کا خوگر نہیں رہنے دیا۔ راتوں کا تو کیا ذکر، اب تو دن کو بھی خواہشوں کے خواب دیکھے جارہے ہیں اور راتیں ہیں کہ خواہشوں کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔ سوتے جاگتے میں خواب نما خواہشوں کے ہجوم سے آنکھیں بوجھل ہیں اور دل اس ہجوم نامہرباں کے ہاتھوں سنگ دل ہو چکے ہیں۔ دماغ ہیں کہ انہیں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

کبھی خواب دیکھنا انسان کا بہترین مشغلہ تھا۔ کیونکہ انسان کے پاس فرصت تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب خوابوں کی تشکیل و تزئین دل و دماغ مل کر کیا کرتے تھے۔ خوابوں کے لیے آنکھیں بند یا سانسیں روکنا نہیں پڑتی تھیں۔ نہ اپنی، نہ اردگرد کی، نہ اہل و عیال کی، نہ سرکاری عمال کی، کیونکہ خواب دیکھنے کے لیے کسی عمل یا ردعمل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ نہ وقت پر سونے کی پابندی، نہ جاگنے کا اعلان، نہ اہل خانہ کو راضی رکھنے کی ضرورت، نہ کسی کی مٹھی گرم کرنے کی چنتا۔ خواب تو فقیر کی صدا اور ماں کی دعا کی مانند درد کی حدہ سے دور ایک جہان عیش و آرام کی مسند پھیلا دیتے تھے۔ اس جہان نو بنو کے نظارے کے لیے آنکھیں کافی تھیں۔ نظاروں کی عادی آنکھیں سنگین سے سنگین، منظر کی عکس بندی اس مہارت سے کرتی تھیں کہ خدائے جمالیات کی کائنات کے رنگ نکھرنے لگتے تھے۔ مگر یاد رہے یہ کل تک کے خوابوں کی روداد ہے۔ جب خواب خود ہی ہمارے خیالوں کی دنیا کے مکین بنتے تھے۔ تب آج کی طرح ہر آنکھ اشکبار نہ تھی۔ کوئی روح شرمسار نہ تھی۔ ہر آنکھ میں خواب سجے ہوتے تھے اور ہر دماغ میں پھول کھلے رہتے تھے۔ مگر اب سماں وحشت ناک ہے۔ خواب خواہش کا پلو پکڑے بغیر کسی ویران گھر میں جھانکتے ہی نہیں۔ حواس و حرص کی مشترکہ سازش نے خوابوں کا چمن لوٹ لیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہمارے خواب فطرت کی ہمنوائی اور صفت خوشنمائی سے محروم ہو چکے ہوں۔ یا پھر ابن آدم کی تدبیر باتقصیر نے خوابوں کو نارسا اور مشکل امر بنا دیا ہے۔

خواب تو درکنار، انسان اپنی طبع غلبہ پسند سے ہر شے کو پابند سلاسل کر رہا ہے۔ ہر شے کے گرداگرد فصیلیں اور بلند دیواریں کھڑی ہو رہی ہیں؛ اتنی بلند کہ امن اور آدمیت جیسے قد آور کارکن بھی دیواریں پھلانگ کر مدد کرنے کی کوشش کریں تو زخمی ہو جاتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا، بادصبا، خوشبوئے مہر و وفا کا گزر ہو تو کیسے ہو؟ شہر محبس میں خوابوں کا گزر اگرچہ اب بھی ہوتا ہے مگر خال خال۔ البتہ مسخ شدہ آرزوئیں اور خواہشیں ہیں جو ہر چوک اور چوراہے پر قبضہ جمائے، ہر آتے جاتے کے منہ لگ رہی ہیں۔ انہی ناشائستہ خواہشوں کو انسان نے ضرورتوں کا نام دے دیا ہے۔ جب یہ خواہشیں چور دروازے سے دماغ میں داخل ہوتی ہیں تو دماغ کی نس نس کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ صرف چور اُچکے ہی چور دروازے سے داخل ہوتے ہیں چاہے ان کے ہاتھ میں چھڑی ہو یا

تسبیح ہو۔ خواہشیں دماغ کو مخرب بنا کر دم لیتی ہیں۔ دماغ کے پاس ردی کی ٹوکری تو ہوتی نہیں کہ خوابوں کا لباس پہن کر آنے والی خواہشوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دے۔ دماغ جب بھی ان نامراد خواہشوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا ہے۔ خواہشیں کسی دہشت گرد کی طرح پورے دماغ کو یرغمال بنا لیتی ہیں۔ چنانچہ خواہشوں کو مار مٹانے کی ہر کوشش دماغ کے بینر، خانے تک برباد کر دیتی ہے اور جب کبھی یہ خواہشیں دماغ سے باہر آتی بھی ہیں تو دماغ کا کوئی نہ کوئی حصہ اپنے ساتھ لے کر نکلتی ہیں۔ اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ نامراد خواہشیں دماغ کو چاٹ چاٹ کر صاف تختی کر دیتی ہیں۔ جس پر ماضی، حال اور مستقبل کا کوئی نشان اور نقش تک باقی نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ خواہشیں آسودگی کا سارا ساز و سامان جلا کر راکھ کر دیتی ہیں۔

دوستو! مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں یہ قبضہ گیر خواہشیں ہمارے دل و دماغ پر بھی قبضہ نہ کر لیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ قبضہ گروپ دنیا میں کتنے سرگرم ہیں۔ زمینیں، جائیدادیں قبضے کے ذریعے ہتھیائی جا رہی ہیں۔ طاقتور ممالک کمزور ممالک پر قبضے کر رہے ہیں۔ دماغ اور اعصاب کو مفتوح و مفلوج کیا جا رہا ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ تک قبضے میں لیا جا رہا ہے۔ قابض اپنی غلبہ پسند طبیعت کے زور پر زیر قبضہ افراد اشیاء کی حالت اور ہیئت کو بدل کر کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جب ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو حملہ آور بنا کر پیش کیا گیا۔ پورے پورے ادیان کی شکلیں ہی تبدیل ہو گئیں۔ قابض تو یہ نہیں دیکھتا کہ کوئی شے کتنی قدیم ہے؟ کتنی عظیم ہے؟ کتنی قیمتی ہے؟ کتنے عظیم انسانوں کے مقدس خون سے اسے سینچا گیا ہے؟ قابض اور غاصب تو لعل و جواہر اور ٹھیکری کو ایک ہی ترازو میں تولتا ہے۔

ہم خواہشوں کا قصہ لے بیٹھے، ہمارا سوال اب بھی باقی ہے کہ خواب کہاں سے آتے ہیں؟ خواب دماغ کا معاملہ ہیں یا دل کا مسئلہ ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ خواب بھی انسانی مزاج رکھتے ہوں اور خواب بھی خواہشوں کی صحبت اور سازش میں شریک ہوں۔ یہ کیسے خواب سننے اور دیکھنے کو ملے ہیں۔ ہم نے بڑے بوڑھوں سے سنا تھا کہ خواب حواس خمسہ کی مجموعی کاوش کے نتیجے میں ذہن و فکر سے ماورا شعور و لاشعور کے سنگم پر جنم لیتے ہیں۔ خواب تو زندگی کا حسن ہوتے ہیں جو ہمارے لاشعور سے تختی شعور پر ایسے نمودار ہوتے ہیں جس طرح ستارے آسمان پر اچانک جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

خوابوں کا کھیل بھی عجیب کھیل ہوا کرتا تھا کہ جس میں نفع و نقصان کی پرواہی نہ ہوتی تھی۔ ہر شخص آزاد تھا چاہے وہ کھلی آنکھوں سے خواب دیکھے یا بند آنکھوں سے۔ دن کو جاگتے میں خواب دیکھے یا رات کو سوتے میں خواب دیکھے۔ انسان اپنی مرضی اور منشا کا مالک ہے، چاہے تو خواب غفلت کو پسند کرے اور خواب خرگوش کے مزے لے کر لمبی تان کر سوئے یا جاگ کر زندگی گزارے۔ خوابوں کا شہزادہ اور شہزادی بن کر رہے، سروری کرے یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ خواب کسی کے پابند ہوتے ہیں نہ کسی کو اسیر کرتے ہیں۔ البتہ خواہشیں انسان کو اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ اور غلام کی نہ تو نیند اپنی ہوتی ہے اور نہ ہی نصیب پر اس کا بس چلتا ہے۔ سوتے میں دیکھے گئے خواب عموماً شیریں اور میٹھے ہوتے ہیں اور اگر تلخ ہوں تو ٹوٹ جاتے ہیں۔ خواب ڈراؤنے اور بھیانک ہوں تو وحشت زدہ کر دیتے ہیں۔ خواب جیسے بھی ہوں انسان کے اپنے ہوتے ہیں۔ خوابوں میں انسان کا کوئی ساجھی اور حصہ دار نہیں ہوتا۔ خواب علوم کی طرح کسی کی میراث نہیں ہوتے۔ اس لیے خواب نہ تو چوری ہو سکتے ہیں، نہ سرمائے کی طرح منتقل ہوتے ہیں، نہ فصلوں کی طرح اُجڑتے ہیں، نہ باغوں کی طرح ویران ہوتے ہیں، نہ دل کی دنیا کی طرح برباد ہوتے

ہیں۔ خواب تو بس خواب ہوتے ہیں اسی لیے جلد ہی خواب و خیال ہو جاتے ہیں۔ خواب نہ مہنگے ہوتے ہیں، نہ سستے ہوتے ہیں، نہ بکتے ہیں، نہ سسکتے ہیں۔

حالات واقعات سانحات معتقدات اور مناقشات چاہے کوئی رنگ اختیار کرے خواب کبھی اپنی اصلیت تبدیل نہیں کرتے۔ اگرچہ آج ہر شے اصلی اور نقلی کے خانوں میں بٹ چکی ہے۔ جھوٹ اور سچ نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لیے ہیں۔ مگر خوابوں کو کسی نے نہ تو نقلی کہا ہے اور نہ خوابوں کو پرانا کہنے کی کسی نے جرات ہوئی ہے۔ کوئی خوابوں میں کھوٹ یا ملاوٹ کی کوشش کرے تو خواب پیوند لگی پوشاک کی مانند زرق برق نہیں رہتے۔ کوئی خوابوں پر نقلی رنگ چڑھانے کی کوشش کرے تو خواب اس سے یوں روٹھ جاتے ہیں جس طرح کوئی باوفا صنم سرکار حسن میں گستاخی پر ناراض ہو جائے۔ مگر جسے دیکھو خواہشوں پر خوابوں کا رنگ چڑھائے دوڑ رہا ہے۔ کوئی گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالنے کے لیے خواہشوں کو خواب بنائے کندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ اس گٹھڑی سے کبھی ہیرا برآمد نہ ہوگا۔ اسی حال میں اپنے اور اپنے خاندان کی کمریں دوہری کر چکا ہے۔ اور خواہشیں ہیں کہ نہ اس کے دماغ سے نکلتی ہیں، نہ کندھوں سے اُترتی ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ خواہش اور خواب کو الگ الگ کرنا اور ان کی صفات کو پرکھنا کچھ آسان نہیں۔ کیونکہ خواب اور خواہشوں میں بہن بھائی کا رشتہ ہے۔ یہ قریبی رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ بلکہ مشکل حالات میں دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے مددگار اور جان نثار بن جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ جڑواں بہن بھائی ہیں۔ ان میں حجاب کم اور بے تکلفی زیادہ ہے۔ پھر عمومی دستور کے مطابق بہن ہمیشہ پردے میں رہتی ہے اور پردے ہی میں رہ کر کبھی بھائی کی زبان بن جاتی ہے، تو کبھی عادات وصفات بن کر جلوہ گر ہوتی ہے۔ شکل وصورت میں مشابہت، عادات میں یکسانیت اور مزاج میں وحدانیت کے سبب سے اکثر لوگ خواب اور خواہش کو پہچاننے میں غلطی کرتے ہیں۔ کوئی کتنا ہی جہاندیدہ اور زیرک کیوں نہ ہو ایک مرتبہ ضرور دھوکہ کھاتا ہے۔

خواب اور خواہش میں لطیف سا فرق ہوتا ہے۔ خواب ذاتی اور انفرادی ہوتے ہیں۔ خواہشات سب کی یکساں اور اجتماعی ہوتی ہیں۔ مثلاً: معاشی جدوجہد کرنے والوں کی خواہش سوائے معاشی خوشحالی کے کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ ہر مزدور تنخواہ میں اضافے کی تمنا لیے پھرتا ہے۔ ہر کسان فصل کے لیے سازگار موسمی حالات کا خواہشمند ہوتا ہے۔ ہر وکیل اپنے کلائنٹ کی راہ تکتا رہا ہوتا ہے۔ ہر دکاندار زیادہ نفع کے لالچ میں صبح شام معذرت کرتا ہے۔ ہر عاشق اپنے محبوب کو رام کرنے کے لیے رام رام کرتا ہے۔ یا پھر ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کی خواہش کس ملک کی نہیں ہوگی، سماجی انصاف کا کون خواہاں نہیں، افلاس سے کون نجات نہیں چاہتا، وافر خوراک کس گھر کی خواہش نہیں، صحت مند زندگی بسر کرنا کس کی تمنا نہیں؛ البتہ ناقص غذا، جھگڑالو بیوی، باتونی دوست، دائمی بیماری، نت کا مہمان اور نکھٹو اولاد سے نباہ تو ممکن ہے، سب کر لیتے ہوں مگر ان کے ساتھ خوش وخرم زندگی کے خواب کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ جیسے بادشاہ بننے کا خواب یا بادشاہ گھر بننے کا خواب، سچ کے حکمرانی کا خواب، بیگمات کو قطار اندر قطار دیکھنے کا خواب، اچھے ہمائے کا خواب، دنیا کے ممالک میں قانون کے حکمرانی کا خواب، تو ہر ایک دیکھ سکتا ہے مگر انہیں خواہشیں بنا کر صرف احمق ہی پیش کر سکتا ہے۔ کیونکہ خوابوں کا منصب عکس بنانا، نقش بنانا، سرشار کرنا اور مست کر دینا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خواہشیں سراب دکھاتی ہیں، سراب کے لیے دوڑاتی ہیں۔ اپنے اسیر کو تھکا کر نحیف ونزار کر دیتی ہیں۔ خواہشیں کبھی

سیر چشم نہیں ہوتیں۔ بلکہ شکم سیر ہی نہیں ہوتیں۔ تبھی تو ہر خواہش دوسروں کے مال و متاع کو حاسد کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور دماغ کی کمیں گاہ میں چھپ کر اپنے شکار پر وار کرتی ہے اور جب بھی موقع ملتا ہے اپنے شکار پر پنجے گاڑ دیتی ہے۔ خواب کبھی بھی خطرناک ہتھیاروں سے لیس نہیں ہوتا۔ اس لیے بے ضرر ہوتا ہے۔

حقہ بردار

حقہ بردار کون ہیں؟ زمانہ ءقدیم سے موجود چلے آرہے ہیں یا عصر حاضر کی ضرورتوں نے انہیں جنم دیا ہے۔ اس ضمن میں محققین ابھی تک مصروف عمل ہیں۔ بلکہ صاف بات تو یہ ہے کہ شش و پنج میں مبتلا ہیں اور آپ کو تو معلوم ہے جب بھی ہمارے علماء شش و پنج میں مبتلا ہوتے ہیں تو نتیجہ نہ شش ہوتا ہے اور نہ پنج ہوتا ہے۔ بلکہ گمان راہ پا جاتے ہیں۔ اس لئے یہ تو یقین کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے ہاں کی طرح دنیا کے دیگر ملکوں میں حقہ برداروں کی کوئی نسل باقی ہے یا مقطوع ہو گئی ہے۔ یوں ہی سرسری نگاہ ڈالنے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حقہ بردار آج دنیا میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں مگر دکھائی کم دیتے ہیں۔ پہلے پہل حقہ برداروں کی کوئی مخصوص پہچان اور شناخت بھی نہیں تھی مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔ کرۂ ارض کے ہر خطے میں انسانی سماج مسلسل تبدیلیوں کے عمل سے گزر رہا ہے مگر حقہ بردار آج بھی پوری مستعدی سے شیوۂ سردار شناسی کا ہنر آزمارہے ہیں۔ اس شیوۂ سردار شناسی میں ہم ان سے پیچھے ہیں، نہ آگے ہیں۔ کیونکہ پیچھے رہ جانا غداری ہے اور آگے بڑھ جانا گستاخی ہے۔ گستاخی اور غداری کا مرتکب ہونا نہ کل قابل فخر تھا نہ آج قابل فخر ہے۔ کیونکہ ہم ہمیشہ ہی سے سرکار نامدار کا دم بھرتے رہے ہیں اس لیے قوم کے سرداروں کے ساتھ اپنے چہروں کا رخ ہوا کے رخ کے موافق کر لیتے ہیں۔ یعنی کبھی شمال کی طرف، کبھی جنوب کی طرف اور کبھی ذنوب کی طرف؛ جس کا مقصد شر اور شہرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ جس طرف سردار نے 'کا رخ پھیرتا ہے، ہم حقہ بردار قوم کے منہ بھی اسی طرف پھر جاتے ہیں۔

قوم سے یاد آیا کہ تاریخ و تخیل نے جب جب ہماری قوم کے ماضی اور حال کو یکجا کر کے دیکھا تو یہی حقیقت بدیہی حقیقت بن کر سامنے آئی کہ ہمارا آج، کل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ یعنی ہماری قوت ایمانی اور خواہشات شیطانی کے مابین نہ پہلے جنگ تھی اور نہ آج جنگ ہے۔ ہم کل بھی حقہ تازہ کرنے اور ایمان کو تر و تازہ رکھنے کے ہنر سے خوب واقف تھے اور آج بھی ہیں۔ اسی طرح ہمارا قومی کردار اور قومی شعور نہ کل بیدار تھا اور نہ آج بیمار ہے۔ ہماری اجتماعی دانش کل بھی حقہ بردار کے تال و قال کی رہین رقص تھی اور شاید آئندہ بھی رہے۔ دوسروں کی پیکار پر رقص کرنا بھی عجیب ہے کہ رقص میں مست آدمی کا دماغ، دل، دولت، دلیل اور دانش سمیت ہر چیز رقص کے چکر میں محصور ہو جاتی ہے اور آپ تو جانتے ہیں، رقص جب ایک بار شروع ہو جائے تو نگاہوں سے ہر عکس و نقص اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور ہماری نگاہیں دیکھتی رہ جاتی ہیں۔

ایسے میں ہمارے رویے اور رستے عجیب ہو جاتے ہیں۔ دانش کے در بند اور دیوانگی کے در کھل جاتے ہیں۔ دانش کا در بند دیکھ کر ہر طرح کے حقہ بردار اس گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ معاملہ ذاتی ہو تو ہم حالات کے سامنے سینہ سپر ہونے میں دیر اور گریز نہیں کرتے۔ مگر جب نقصان کا خطرہ پوری قوم کو ہو تو ہم عموماً "اپنی آنکھیں اور زبان بند کر لیتے ہیں اور ایسے میں اگر کوئی قوم کی نیند اور نامرادی کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرے تو ہمارے حقہ برداروں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اب تو ہم نے یہ وتیرہ بنا لیا ہے کہ ہم سب انہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، انہی کے کانوں سے سنتے ہیں اور انہی کی زبان بولتے ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اب کہا جا رہا ہے کہ ہماری اور آپ کی پوری کی پوری دانش چوری کر لی گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو جانوروں کی ذہانت و دانش چوری کیوں نہیں ہوتی۔ انہیں کوئی گمراہ کیوں نہیں کرتا، انہیں حیوان دشمنی کوئی کیوں نہیں سکھاتا۔ ان پر بھانڈ اور مسخرے مسلط کیوں نہیں ہوتے؟ مگر خیر جانے دیجیے ان باتوں کو۔ اگر ہم پر مسخرے، میراثی، شریر اور حقہ بردار مسلط ہو چکے ہیں تو کیا ہوا یہ پرانا قصہ ہے اگر آپ

کو یاد نہیں تو میں آپ کو یاد دلاتا ہوں، کچھ زیادہ پرانی بات نہیں۔ یہی کوئی چالیس پینتالیس سال بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ ہماری شہری آبادی ابھی اتنی زیادہ نہ تھی اور شہر بھی بیمار اور لاغر بچوں کے پیٹ کی طرح پھول کر کپے نہیں ہوئے تھے اور رہائشی کالونیوں نے بھی عذاب الٰہی بن کر ہماری ثقافت کو نگلنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہماری ثقافت اور ہمارے دیہات پوری تاب و توانائی کے ساتھ اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ ہر زمیندار، سردار کا ڈیرہ آباد تھا۔ جہاں بھوکے کو کھانا اور مسافر کو شب بسری کے لیے ٹھکانا مل جاتا تھا۔ سگریٹ کی وبا بھی ابھی اتنی عام نہ ہوئی تھی۔ ہر مہمان کو کھانے کے بعد تازہ کیا ہوا حقہ ملتا تھا۔ حقہ بردار ہی عموماً "ہر ڈیرے پر حقہ تازہ کرتا اور ساتھ ہی مزے مزے کی باتیں بھی مہمانوں کو سناتا تھا۔ یہ حقہ بردار کون تھا؟ اور کہاں سے آیا تھا اور چوبیس گھنٹے زمیندار کے ڈیرے پر ہر کسی کی خدمت کیوں کرتا تھا؟ یہ تو وہ خود بھی شاید نہ جانتا ہو۔ البتہ یہ طے ہے کہ زمیندار کے ڈیرے پر ہر کہ ومہ کی خدمت کرنے والا یہ حقہ بردار، بچہ، بوڑھا، جوان یا کسی بھی سن و سال کا آدم زاد ہو سکتا تھا۔ اس کا کوئی ماضی نہ تھا اور نہ ہی مستقبل۔ اگر اس کا کہیں کچھ ماضی تھا تو ہرگز قابل ذکر نہ تھا۔ اسی ماضی سے چھٹکارا پانے کے لیے ہی تو اسے زمیندار کے حوالے کیا گیا تھا۔ عموماً "ایسے لوگ جن کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا تھا یا وہ جو والدین کے لیے عذاب الٰہی بن جایا کرتے ہیں۔ یا اسی قبیل کے افراد کی آخری پناہ گاہ زمیندار کا ڈیرہ تھا۔ یعنی ناخلف اولاد اور بگڑے بچے یہیں پلتے اور ڈھلتے تھے۔ انہیں زمیندار کے سپرد کر دیا جاتا۔ ان کا بس یہی کام تھا کہ سب کو خوش رکھیں اور چاہے وہ خود خوش رہیں یا نہ رہیں کہ اس سے کسی بندہ بشر کو کوئی غرض نہ تھی۔ انسان بھی کس قدر ناانصاف واقع ہوا ہے، جن سے خوش رہتا ہے، انہیں خوش دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ خیر بات حقہ بردار کی ہو رہی تھی۔ حقہ بردار کو یہاں زمیندار کے پرانے نمک خوار بات بات پر، فحش گالیوں اور مسلسل لعن طعن سے ڈھیٹ بنا کر حقہ تازہ کرنے کی خدمت پر مامور کر دیتے۔ جہاں اسے ہنس ہنس کر گالیاں کھانے کی عادت سی ہو گئی اور عادات قبیح ہوں یا کریہہ ہوں، اپنے شکار کی حس خودداری کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔ زمیندار کے ڈیرے پر پلنے والا یہ حقہ بردار کسی ریموٹ کنٹرول روبوٹ سے کم نہ تھا۔ یہ ہر طرح کے مہمان کو خوش رکھ سکتا تھا۔ اور اپنے کردار کو ہر کردار میں ڈھال سکتا تھا۔ گالیوں کی بوچھاڑ کے سامنے ڈٹ سکتا تھا۔ وہ گا سکتا تھا، وہ گانے والے کی ہو بہو نقل اتار سکتا تھا۔ اسے ناچنے سے بھی باک نہ تھا، وہ نائی کا کام بھی کر سکتا تھا، وہ بھانڈ پن میں بھی طاق تھا، وہ ریڈیو بن سکتا تھا، خبریں سنا سکتا تھا، خبریں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ بندر بن کر کسی بھی آدمی کی تذلیل کر سکتا تھا، وہ لگائی بجھائی کر سکتا تھا، وہ کتے کی طرح بھونک سکتا تھا، حتیٰ کہ بھونک کر کتوں کو متوجہ کر سکتا تھا۔ وہ تقریر کے فن اور فریب کے گر جان چکا تھا؛ مگر اس سب کے باوجود وہ زمیندار کے کھونٹے سے بندھا ہوا تھا۔ خدا نہ کرے کوئی بندھا ہوا جانور یا جانور نما رسی توڑنے میں کامیاب ہو۔ کیونکہ دونوں فصلیں یا نسلیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ حقہ بردار کی راسیں زمیندار کے ہاتھ میں تھیں جنہیں وہ ایک حد تک ہی ڈھیلا کرتا تھا۔ جس طرح ہماری ہر تعمیر و تخریب کی سرحد اور سرے امریکہ سے ضرور جا ملتے ہیں۔

والدین کی شفقت سے محروم، حقہ تازہ کرنے کی خدمت پر مامور، حقہ بردار نے جب دیکھا کہ کتاپن کی اضافی ذمہ داری سے اہمیت میں اضافہ ہونے لگا ہے تو وہ کتاپن کے فن پر باقاعدہ توجہ دینے لگا۔ آج بھی جب کوئی بھونکنے کی اضافی ذمہ داری سنبھال لے تو جان لیجیے، حقہ برداروں کی نسل خوب پھل پھول رہی ہے۔ معلوم نہیں حقہ بردار کے جی میں کیا بات آئی کہ ایک دن زمیندار کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر زمیندار کے لیے بچھائی گئی چارپائی پر چڑھ بیٹھا اور جھوٹ موٹ کا زمیندار بن کر فیصلے کرنے لگا۔ اسے اپنا یہ کردار بہت ہی اچھوتا اور اچھا لگا۔ اور آپ تو اس طرح کے ڈرامے ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں کہ ڈراموں میں نقلی کردار

اصلی کردار کا روپ دھار کر خوب دھونس و دجل سے کام لیتے ہیں۔ اگر ان کا یہی رعب و دبدبہ حقیقت کا چولا پہن لے تو سماں کتنا وحشت ناک ہو۔ چنانچہ اب جب بھی اس کی حس ہوس بیدار ہوتی تو وہ وقت بے وقت کبھی زمیندار کا روپ دھار لیتا اور کبھی سرکار کا۔ سب محظوظ ہوتے۔ اور کچھ مہمان تو خوش ہو کر اس کی جیب میں چونی اٹھنّی بھی ڈال دیتے۔ اب وہ حقہ تازہ کرتا تو چونی اٹھنی کی امید رکھتا۔ اور کبھی کبھی تو حقہ تازہ بھی نہ کرتا اور زمیندار کے مہمانوں، ملنے والوں اور دوستوں سے چونی اٹھنّی اینٹھ لیتا۔ مکاری، عیاری کو نسبی نابکاری کا پانی لگا تو دبی ہوئی نسلی اور نامراد خواہشوں کے کانٹے نکل آئے۔ پھر ایک دن اس کی ملاقات اپنے جیسے حقہ بردار سے ہوئی۔ دونوں میں کچھ صلاح مشورہ ہوا۔ پھر کچھ روز بعد یہ خبر آئی کہ زمیندار کے کھونٹے سے بندھا ہوا حقہ بردار اچانک غائب ہو گیا ہے۔ زمیندار کے کھونٹے سے بندھا ہوا یہ کردار جب رسی تڑوا کر بھاگا تھا تو ایک ہی خیال اس کے ذہن پر ذلت بن کر سوار تھا کہ جو بھی ہو، پر میری شناخت نہ ہو۔ اور حق یہ ہے کہ جب تک عزت اور ذلت کا فرق ملحوظ خاطر رہتا ہے، ابن آدم میں انسانی قدروں کی طرف لپکنے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب عزت و ذلت کے احساسات گہری نیند سو جاتے ہیں۔ تب کوئی کچھ کرتا پھرے، یا ہوتا رہے؛ عزت اور غیرت نام کی چیزیں اضافی بوجھ سمجھ لی جاتی ہیں۔ قدرت کے کھیل بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ اور اس کا بندہ اسی عجب ہی میں گرفتار نت نئے سفر کے لیے رخت سفر باندھے رہتا ہے۔ کبھی رخ ذات کی طرف ہے تو کبھی کائنات کی طرف۔ نہ راز نہاں پہ خوش، نہ اس کے عیاں ہونے پہ راضی۔ دنیا کا ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی کوئی شناخت اور پہچان ہو۔ اور میں عام انسانوں میں الگ پہچانا جاؤں۔ مگر حقہ بردار ہے کہ اپنی شناخت کو سمندر کی گہرائیوں میں دفن کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو ڈیرے سے بھاگا ہی اس لیے تھا کہ کسی طرح اپنی شناخت کو دریا برد کرے۔ تاکہ اسے ماضی اور مضافات سے نجات ملے۔ اب اس کے پاس دو ہی راستے رہ گئے تھے کہ یا تو وہ جنگلوں اور پہاڑوں کا رخ کرے یا پھر انسانوں کے جنگل میں خود کو چھپا لے۔ اگر وہ جنگلوں یا پہاڑوں کا رخ کرتا۔ جنگل صاف کرتا، زمین ہموار اور قابل کاشت بناتا۔ یا پہاڑ کاٹتا، معدنیات نکالتا، پہاڑوں سے رستے نکالتا، اگرچہ یہ رستہ مشکل تھا مگر تھا باوقار۔ یوں اس کا بھی کوئی وطن ہوتا، گھر بار ہوتا۔ مگر بزدلی حقہ بردار کے لیے رکاوٹ بن گئی۔ کیونکہ ایسے کردار ازلی بزدل اور ابن الوقت طبعیت کے ہوتے ہیں۔ جب تک مالک اور مال میدان میں موجود رہیں، سورما نظر آتے ہیں۔ مگر جیسے ہی ان دو میں سے کسی ایک کا ہاتھ ان کی پشت سے ہٹتا ہے، ان کی حمیت، ہمت اور حرفت سب جواب دے جاتے ہیں۔ چونکہ اسے تولت پڑ چکی تھی؛ بندر بننے کی، ناچنے کی، بھانڈ پن کی، گدھا پن کی، کتا پن کے ذریعے مال ہتھیانے کی، نقلیں اتارنے کی، اس لیے پہاڑ کاٹنے کا کام اسے پہاڑ نظر آیا۔ چناں چہ اس نے اپنی نسلی نسبت کے رنگوں میں خود کو رنگ لیا اور انسانوں کے جنگل میں خود کو گم کرنے میں عافیت محسوس کی کہ اس کے لیے خیر اسی میں تھی۔ اگرچہ ان کی تعداد بڑھ رہی ہے اور کردار بھی نئے نئے دیئے جا رہے ہیں، تس پر اپنا نام اور نسب بتانے سے صاف گریزاں ہیں۔ بزرگ تو ہمیشہ ایسے کرداروں سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ جن کا کردار ذاتی نہ ہو اضافی ہو اور یہ اضافی کردار ہمیشہ اصلیت ظاہر ہونے پر غائب ہو جاتے ہیں۔ آپ غریب ممالک اور اس کی اشرافیہ کو دیکھ لیں جب سے انہوں نے اضافی کردار نبھانا شروع کیا ہے۔ عوام کا خون اور اشرافیہ کی شرافت ناپید ہو گئی ہے۔ حقیقت ہے کہ جتنی کثرت سے یہ کردار وطن عزیز میں پایا جاتا ہے دنیا کے دوسرے ملکوں میں ایسا شاید ممکن نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ اس نسب و نسل سے ابلیس بھی پنجہ آزمائی کرنے سے گھبراتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب یہ مخلوق شکلیں بدل بدل کر انسانیت پر حملہ آور ہوتی ہے تو شیطان تک کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے

ہیں۔ یونہی شیطان ہٹ دھرمی سے کام لے اور شکست تسلیم نہ کرے تو اور بات ہے ورنہ، جس طرح آج زندگی کا ہر شعبہ ان حاشیہ برداروں کے رحم و کرم پر ہے وہ دن دور نہیں جب یہی حقہ بردار سفید کو سیاہ کر دکھانے پر قادر ہو جائیں گے اور شیطان منہ دیکھتا رہ جائے گا۔ بلکہ کہیں منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہے گا۔ حقہ بردار کے ہاتھ میں توہین و توصیف کی دو دھاری تلوار، کبھی حق کی گردن پر پڑتی ہے تو کبھی باطل کو بھنبھوڑتی ہے تاکہ داد و دہش کا سلسلہ رکنے نہ پائے۔ زمیندار کے ڈیرے سے بھاگے ہوئے حقہ بردار کو جب اپنی جنم بھومی کے اطراف و اکناف کوئی ٹھکانہ نہ ملا تو اس نے اور اس جیسوں نے گنجان آبادیوں کا رخ کیا۔ حقہ بردار جب شہر پہنچا تو اس کے پاس اور تو کچھ نہ تھا، مگر رسوائیوں نے اسے انسانی نفسیات سے خوب واقفیت کرا دی تھی۔ اس نے دیکھا کہ شہر کے الوہر وقت نئے پن کی تلاش میں رہتے ہیں اور نئے پن کو فیشن اور عزت کا اوزار سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے اپنے لباس کو مختصر کیا، ازاں بعد شہر والوں کے چہروں اور جسموں سے لباس شرافت کو نوچ ڈالا۔ انہیں بھی اس راہ بدراہ پر کشاں کشاں لے چلا۔ شہر والوں کی گرفتار بلا ہونے کی عادت سے شہ پا کر اس کی فنریبی فکر نے تصور ہی تصور میں نقشہ جمایا کہ کون سے شعبوں پر قبضہ جمانے سے اسے وہ سب کچھ مل سکتا ہے جس کے خواب، وہ رسوائی کے زمانے میں دیکھتا رہا ہے۔ چنانچہ نظر بد نے باطن بد سے مشاورت کی تو اس نے تین روپ اختیار کرنے کی ٹھان لی۔ اور معزبیوں کے نظام عدالت، وکالت اور صحافت پر قبضہ جمانے میں جٹ گیا۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ قابض اور غاصب کے باطن میں چور ہوتا ہے۔ اور کوئی چور کب چاہے گا کہ اس کی چوری پکڑی جائے۔ چنانچہ ہر چور اپنے ساتھ ہر چیز کی ہیئت اور حالت بدل کر رکھ دیتا ہے۔ حقہ بردار نے تہذیبی تقدیس پر پہلا وار یہ کیا کہ ولدیت کے خانے سے باپ کو نکال کر ماں کو لے آیا۔ عدل کو عدالت سے بے دخل کر دیا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا جب تک عدل باقی ہے ظلم کی بنا مضبوط نہ ہو گی۔ اصالت کے دل و دماغ اور زبان و ذہن پر وکالت کے قفل رجیم لگا دیے۔ یہ قفل صرف وہی کھول سکتا تھا جس کے پاس ان کی کنجی تھی۔ نتیجتاً "ہر واسطے کے درمیان ایک واسطہ آن کھڑا ہوا۔ حتیٰ کہ خدا اور انسان کے درمیان پادری اور ملا کھڑے ہو گئے۔ صحف آسمانی کی جگہ صحف شیطانی کا چلن عام ہو گیا۔ پہلے پہل تو سب کچھ ہم سب کی خیر خواہی کے نام پر ہوا۔ مگر آخر کار اخیار و اعیار کی ہمنوائی اور رسوائی پر منتج ہوا۔ آپ تو بہتر جانتے ہیں، حقہ بردار تہذیب و تربیت سے اسی طرح دور تھا، جیسے کتا شہد خالص سے اور کم ظرف متانت سے دور رہتا ہے۔ حقہ بردار شہر آیا تو دیکھا یہاں تو دنیا ہی نئی ہے ہر کسی کو اپنی پڑی ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہ جانتا ہے نہ پہچانتا ہے۔ چنانچہ شہر کی گنجانیاں اس کے لیے گنج گراں مایہ ثابت ہوئیں۔ کہیں جا کر اس نے ڈاڑھی بڑھالی اور تسبیح اٹھالی۔ کہیں اس نے ہاتھ میں مائیک اور منہ میں مخنث کی مکراہٹ بٹھالی، کہیں اپنے مسخرہ پن کو فن منوالیا۔۔ ایک بندر ہو تو کوئی باندھ کے رکھے۔ یہاں تو بندہ بندروں کی قید بے اماں میں ہے۔ ذرا کوئی سچ بول کر دکھائے، بندر کھی کھی کی یلغار، چولی کی جھلکار سے پورے نظام کی چولیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ حیرت ہی حیرت ہے کہ شہر میں آ کر حقہ بردار، یعنی بندر سرکار نے بہت کچھ بدلا، ذات بدل لی، بات بدل لی، اور بات بے بات بدل لی، نیت، نقاب اور نسب تک بدلا، معیار بدلا۔ نہیں بدلا تو کردار نہیں بدلا، جس کے بدلنے کی ضرورت تھی۔ حقہ بردار نے زمانے کا جتنا زوال دیکھا تھا اس سے کہیں زیادہ عروج دیکھا۔ اب تو اس کے اقتدار و اختیار کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ چنانچہ اسے شوق چرایا کہ کیوں نہ اپنی جنم بھومی کو دیکھ لوں اور لوگوں کو مبتلائے حیرت بھی کروں۔ چمکتی کار، قیمتی لباس، کروفر کے ساتھ جنم بھومی کا رخ کیا۔ دور سے ہی لوگوں نے نشانے پر رکھ لیا۔ کوئی کہنے لگا یہ وہی ہے، جو اونچے سروں میں گھگھیا کر تا تھا۔ دوسرے نے کہا وہی ہے جو خبریں سنایا کرتا

تھا۔ کیا بوڑھا کیا جوان، ہر ایک اس سے اپنی اپنی پسند کے مطابق مطالبے کرنے لگا۔ کوئی جھوٹ موٹ کی خبریں سنانے کی فرمائش کرنے لگا۔ کوئی بھونکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کوئی اسے بندر بنا دیکھنا چاہتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے بندر یا سگ بننے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ کیوں کہ سگِ دنیا بننا تو اس نے خود قبول کیا تھا۔ اس کے کل اور آج میں صرف اتنا فرق تھا کہ گذشتہ کل وہ اس لیے بھونکتا تھا کہ بڑے آدمیوں کو خوش رکھ سکے اور آج وہ اس لیے بھونکتا ہے کہ معاشرے کے معتبر کو مذموم اور مردود کو محترم دکھا سکے۔ البتہ اسے اب کارسگاں کی انجام دہی سے منہ مانگے دام ملنے لگے تھے۔ کل تک بھونکنا اس کا مشغلہ تھا اور آج اس کا پیشہ ہے اور پیشہ ہر پیشہ ور کو جان اور ایمان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

حواس باختہ ہونا

یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ بچے بدحواس نہیں ہوتے بلکہ بڑے بڑے اور بوڑھے ہی عموماً بدحواس ہوتے ہیں۔ عورتیں اکثر بدحواسی کی معراج حاصل نہیں کر پاتیں، بلکہ مرد ہی بدحواسی کی معراج پاتے ہیں۔ غلام کبھی بدحواس نہیں ہوتے۔ ان کے آقا بدحواسی میں کمال حاصل کرتے ہیں۔ کوئی مرد اگر بدحواس ہو کر اس حقیقت سے انکار کر بیٹھے تو مردوں کو مزید کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یوں بھی تو ہم کتنی ہی حقیقتوں کا انکار کر دیتے ہیں۔

بدحواسی کے فلسفے پر یقین رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ بدحواسی کا فلسفہ ہے تو بہت قدیم، مگر ہماری لاپرواہی نے اسے ہماری نگاہوں سے اوجھل رکھا ہے۔ البتہ یہ طے ہے کہ بدحواسی کسی حد تک جارحیت کو ضرور جنم دیتی ہے۔ اور ردعمل کے طور پر ہر بدحواس شخص خیر و خبر بلکہ شر اور شقاوت سے ممکنہ حد تک دور رہنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے کہیں شقاوت یا کہاوت کا شائبہ بھی نظر آئے، تو بدکتا ہے۔ اگر کوئی کہے، بھائی شریعت کی رو سے اولاد کی پرورش اور ان کی تربیت والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ تو اتنی سی بات اسے شر اور شک میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ اپنے ہی بچوں کو شب، شباب اور شبستان کے حوالے سے جانچنے لگتا ہے۔ ایسا آدمی جب تک ہر بات اور ہر مرحلے پر بدحواس نہ ہو لے، اس وقت تک اس کے حواس کام نہیں کرتے۔ لہٰذا قدم قدم پر اسے کسی قانون، اصول یا ضابطے کی ضرورت رہتی ہے۔ تاکہ آئندہ زندگی میں بے اُصولی اور بلیّات سے نجات پا سکے۔ مگر زندگی ہے جب کہ ہر لمحے کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہوتی دکھائی دیتی ہے تو بدحواسی کا شکار شخص پسماندہ ممالک کے قانون سازوں کی طرح قانون سازی اور ضابطہ بندی کو ڈھال بناتا ہے۔ ہر نئے قانون کا اطلاق اور نفاذ سب سے پہلے اپنے پالتو کتے، محلے کے چوکیدار، ٹلائے مطعون، سسرالی رشتہ داروں، بھاگتے چور اور خود پر کرتا ہے۔ چاہے اس وضع داری اور قانون سازی میں اس کا نقصان معمول سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ یوں وہ ہمہ وقت کی مایوسی اور غمگینی کو اپنی ذات کا حصہ بنا لیتا ہے۔

کوئی اسے کہے، عزیز من! مایوس نہ ہوا کریں، مایوسی سے بدحواسی جنم لیتی ہے۔ اور مایوسی گناہ بھی تو ہے اور گناہ صغیرہ بھی ہوتے ہیں اور کبیرہ بھی۔ اور جس سے گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے، وہ بدحواس ضرور ہوتا ہے۔ تو بدحواس ہو کر کہے گا، بدحواسی نہ شر ہے، نہ شقاوت؛ نہ نصیحت ہے، نہ فضیحت؛ نہ حق ہے، نہ ملکیت؛ بلکہ ایک غیر شری کیفیت کا نام ہے؛ جو موسم اور محبت کی قید کے بغیر طاری ہو سکتی ہے۔ دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو، مگر بدحواسی پر یہ قانون لاگو نہیں ہوتا کیونکہ بدحواسی تیسری دنیا کا مزدور اور محنت کش تو نہیں جو ہر قانون کے سامنے سر نیاز خم کر دے۔ بدحواسی بے جان جسم نہیں بلکہ زندہ حقیقت ہے۔ پھر غیر شرعی کی وضاحت یوں فرمائیں گے، بیوی کی ڈانٹ ڈپٹ پر وضعدار شوہر کا گھر سے نکل بھاگنا، طلبہ کی للکار پر اُستاد کا محفوظ یا منحوس مقام تلاش کرنا، نثری یا بدنثلی شاعری کی کتاب کو دیکھ کر فراری کا بدکنا، بلکہ کتاب کو عذاب، شاعر کو قصاب اور شاعری کو اخلاق باختہ کہنا؛ یہ سب کچھ بدحواسی کے ذیل میں آتا ہے۔

ہم اپنے مزاج اور فلسفیوں کے دماغ کے ہاتھوں سخت مشکل میں ہیں کیونکہ کسی بھی نئی بات کو ہمارا مزاج اور فلسفیوں کا دماغ قبول نہیں کرتا۔ اگر آپ کہیں آج کل موسم میں خنکی کچھ زیادہ ہے، تو جواب میں بدحواس ہو کر کہیں گے اس کا ثبوت۔ اگر آپ کہیں، بچے اپنے ہوں یا محلے داروں کے پیارے لگتے ہیں، تو کہیں گے اس کا سبب۔ اوّل اوّل تو وہ بدحواسی کو دماغ میں جگہ دینے کو تیار

نہیں ہوتے مگر جب بدحواسی کو دماغ میں جگہ دینے پر تیار ہوتے ہیں تو بدحواسی کو قبلہء حاجات سمجھ لینے میں باک محسوس نہیں کرتے۔ آخر کار بدحواسی کی حقیقتوں اور فضیلتوں کے دل سے قائل ہو کر بدحواسی ہی کو حواس کا معیار مان بیٹھتے ہیں۔

سنا ہے اب تو مسلسل بدحواس رہنے والوں کی سہولت کے لیے نئے نئے قوانین وضع کیے جا رہے ہیں تا کہ عقل والے عبرت پکڑیں ۔نئے قوانین کی رُو سے عقل و حواس کے سہارے زندگی بسر کرنے والوں کو بھی کچھ نہ کچھ وقت کے لیے بدحواس رہنا ضروری ہوگا۔ علاوہ ازیں جب سے بدحواسی کے ثمرات کا چرچا عام ہوا ہے، اعلیٰ عہدے دار، اعلیٰ حکام، اہل ثروت اور چیدہ چیدہ افراد اپنے نام مستند بدحواسوں کی فہرست میں

درج کرا چکے تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ اس ضمن میں ہمارے ہاں بہترین انتظامات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ قدم قدم پر بدحواس ہونے کے مراکز دستیاب ہیں۔ اگرچہ دستور تو یہی ہے کہ فضیلتوں اور نعمتوں سے اُمراء پہلے مستفید ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ ہمارے ہاں جمہوری رویوں کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اس لیے غریب و امیر سب کو بدحواس ہونے کے یکساں اور بھرپور مواقع میسر ہیں۔ اوّل تو ہر گھر کے اندر بدحواس ہونے کا وافر سامان مہیا کر دیا گیا ہے۔ اگر بالفرض گھر سے کسی کو پوری خوراک نہیں مل رہی تو گھر سے باہر قدم دھرتے ہی بدحواسی کے لیے ہر طرح کا سامان موجود ہے۔ خود دیکھیے اور داد دیجیے۔ کوئی سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا، سب کو بدحواس کر رہا ہے۔ کوئی ہڑتال کرانے کے درپے ہے، تا کہ افرانِ شہر کو بدحواسی کے فلسفے سے آشنا کرا سکے۔ کوئی کسی ایک آدمی کو بھی دنیا میں اپنا ہم درد نہ پا کر سب کو صلواتیں سنا رہا ہے۔ راہگیر ہیں کہ بدحواس ہو کر اپنی راہ لگ رہے ہیں۔ کوئی سڑک پر ٹھیلا لیے کھڑا بدحواسی بانٹ رہا ہے۔ کوئی گاڑی پر سوار بدحواس ہو کر ہارن پر ہارن دیے جا رہا ہے۔ کوئی سپیکر کھول کر کھل کر چندہ مانگ رہا ہے۔ کوئی بہت سے بھکاریوں میں گھرا بدحواس ہو کر چاروں اور تک رہا ہے۔ غرض ہر کسی کے لیے ہر طرح کا انتظام موجود ہے۔ یہ سب انتظامات اس لیے کرائے گئے ہیں تا کہ تجربات و مشاہدات کے حصول کے لیے غیر ممالک کے دھکے نہ کھانے پڑیں بلکہ معمول کے مطابق ہر ایک اپنے وطن میں ہی بدحواس ہونا سیکھ لے۔ پہلے بھی ہمارے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ڈاکٹرز، انجینیئر، محنت کش، مزدور بدحواس ہو ہو کر غیر ممالک کو سدھار رہے ہیں۔ جس سے ہماری جگ ہنسائی ہوئی ہے۔ اب ہم کچھ ایسے انتظامات کر رہے ہیں کہ بدحواسی کو بطور صنعت دنیا بھر میں متعارف کرائیں گے اور یہ ٹیکنالوجی دوست ممالک کو تو یونہی عطیہ کر دیں گے۔ مگر بدحواس افراد کی تربیت یافتہ کھیپ کو غیر ممالک ہرگز نہ جانے دیں گے۔

بڑے بڑے فلسفیوں، دانشوروں اور عقلمندوں کا دیوانہ اور بدحواس ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ دراصل بدحواسی ہی اعلیٰ شعور کا منبع ہے۔ ورنہ کم عقل کو کس نے دیوانہ ہوتے دیکھا ہے۔ کسی نے کبھی ڈھیٹ، رذیل، غلیظ، نکمے، ان پڑھ فاتر العقل، مخبوط الحواس، جاہل اور کندہ ناتراش کو بدحواس ہوتے نہیں دیکھا ہوگا۔ انہیں بھڑ کاٹ کھائے یا بھڑ والگے پڑ جائے، وہ نہ تو بدن کو کھجاتے ہیں اور نہ ہائے وائے کی فریاد کرتے ہیں۔ بلکہ بھڑ کو مکھی مچھر سمجھتے ہوئے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ مگر عقلمند آدمی ہمیشہ بھڑوں اور بھڑوؤں سے بدحواس ہو کر کنی کترا لیتا ہے۔ ہمارے دانشور تو یہاں تک ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ سیاستدان، دشمنِ ایمان، صنم نامہربان کے علاوہ کبوتر باز، بٹیر باز، مقدمہ باز اور پولیس والے ہرگز

بدحواس نہ ہوں گے۔ کیونکہ یہ زندگی گزارنے کا اعلیٰ شعور ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان کا پختہ یقین ہے کہ جو شخص بدحواس نہیں ہوتا یا تو وہ قومی مجرم ہے یا فاتر العقل ہے۔

ہمارے فلاسفہ، بدحواسی کو فراست اور فضیلت کے جس مقام پر لے گئے ہیں اس سے آگے یا تو خدا ہے یا کچھ بھی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نعمتیں یا خدا بانٹتا ہے یا بدحواسی کے طفیل عام انسانوں کے حصے میں آتی ہیں۔ اسی لیے تو بدحواس رہنے پر کوئی ٹیکس نہیں۔ کوئی پابندی نہیں۔ وقت اور وراثت کی قید نہیں، ہر کوئی بدحواس ہو سکتا ہے۔ آج ہمارے فلاسفہ بدحواسی کی حمایت میں یوں رطب اللسان نظر آتے ہیں، خوشامد بری بلا ہے، بدحواسی بری بلا نہیں۔ جھوٹ برائی کی جڑ ہے، بدحواسی کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے، بدحواسی میں عقل استعمال ہی نہیں ہوتی، تو خرچ یا کم کیوں کر ہو گی۔ شاعری قدیم بھی ہوتی ہے اور جدید بھی، بدحواسی پر یہ قانون لاگو ہی نہیں ہوتا۔ خیالات فرسودہ بھی ہوتے ہیں اور روشن بھی، بدحواسی میں تخصیص ہی نہیں ہوتی۔ وہم لاعلاج مرض ہے، بدحواسی ہرگز لاعلاج مرض نہیں۔ بلکہ علاج کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی؛ آدمی خود بخود نارمل ہو جاتا ہے۔ نفرت کا پھل کڑوا اور صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، بدحواسی پھلتی پھولتی ہی نہیں، تو کڑوا پھل کہاں سے آئے گا۔

بدحواس فلسفیوں کی دیکھا دیکھی سب کو حوصلہ ملا تو یار لوگوں نے بدحواسی کا جدید مکتب فکر وجود میں لانے کا اعلان کر دیا۔ تاکہ اس مکتب فکر کے ذریعے اہل یورپ کو نیچا دکھایا جائے۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ بدحواسی کے لفظ کی قواعدی حیثیت پر بحث چھڑ گئی۔ بدحواسی کو مذکّر سمجھا جائے یا مؤنث قرار دیا جائے۔ جب معنی و مطالب جاننے کی نوبت آئی تو سب کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کسی نے کہا، پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدحواسی کی عمر کتنی ہے؟ سنِ بلوغ یا سنِ شباب کو موضوع بحث بنایا گیا ہے یا نہیں۔ اگر سنِ بلوغ کو نہیں پہنچی تو پھر انتظار کرنا لازمی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔ کے مراحل گزر چکے ہوں اور اہلِ عشق فنا کے گھاٹ اُتر گئے ہوں۔ کسی دوسرے نے کہا، عدت گزر چکی ہے یا ابھی کچھ دن باقی ہیں۔ شادی پر راضی ہے یا زیادہ حق مہر کا لالچ کر رہی ہے۔ شکل و صورت کی واجبی ہے یا شوخ و چنچل ہے۔ آبائی جائیداد سے زرعی اراضی بھی ساتھ لائے گی یا نہیں۔ بدحواسی میں سارے سوال اور خیال دھرے کے دھرے رہ گئے۔

فلسفۂ بدحواسی کے نتائج و عواقب کچھ بھی ہوں مگر سچ یہ ہے کہ بدحواسی علوم انسانی کا واحد شعبہ ہے جس کے بل پر ہم یورپ امریکہ کو آنکھیں اور نیچا دکھا سکتے ہیں۔ ان کی برتری کے زعم کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یورپ تو کیا امریکہ تک میں بدحواسی کا اب تک کوئی مکتبِ فکر یا فلسفہ وجود میں نہیں آیا بلکہ ان کی تعلیمی پستی کا یہ عالم ہے کہ ان کے ہاں مکتب اور مسلک ہوتے ہی نہیں، تو مکاتبِ فکر کہاں سے آئیں گے۔ صرف اکیلی فکر لے کر وہ کیا کریں گے۔ ہمیں کم عقلی اور جہالت کا طعنہ دینے والا یورپ اور امریکہ دیکھے۔ ہم بدحواسی، پاپ سنگنگ اور فیس بک کے دانش گروں کے ادغام سے کیسے کیسے کام لے رہے ہیں۔ پاپ سنگنگ تو بدحواسی کی طرح ہمارے ہاں نہایت ہی افتادی بلکہ اجتہادی فن کا مقام اور درجہ حاصل کر چکا ہے۔ پاپ سنگنگ کی دریافت سے پہلے عادی مجرموں کو اقرارِ جرم کرانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے اور ظالمانہ حربے آزمائے جاتے تھے۔ ملزم کو بھوکا رکھا جاتا تھا یا بے تحاشا کھانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ صحت مند پولیس والوں کے ساتھ خراٹوں کا مقابلہ کرانے کی دھمکی دی جاتی تھی۔ پانچ منٹ کے نوٹس پر نیند کی آغوش میں چلے جانے کا حکم صادر ہوتا تھا۔ اذیت ناک ماحول میں رکھا جاتا تھا یعنی مجرم کو کچھ دنوں کے لیے پولیس والوں کے ساتھ ٹھہرنا پڑتا تھا۔ اُلٹا لٹکا دیا جاتا

تاکہ مجرم عام انسانوں اور پولیس میں فرق کو بلند مقام سے دیکھ سکے۔ آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر پولیس والوں کو نماز یاد کرانے کا حکم دیا جاتا تھا۔ عادی مجرم کے اہل خانہ کو تھانے میں حبس بے جا میں رکھا جاتا۔ دور دراز کے تھانوں میں مجرم کو عریاں ڈانس پر مجبور کیا جاتا۔ جانے کیا کیا گفتہ و ناگفتہ بہ گُر آزمائے جاتے تھے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات یعنی مجرم ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔

بھلا ہو، پاپ سنگنگ اور بدحواسی کی افادیت دریافت کرنے والوں کا کہ ہمارے ہاں تفتیش کے روایتی اور فرسودہ طریقوں کو یک لخت ترک کر دیا گیا ہے۔ بڑے سے بڑے عادی مجرم سے سچ اُگلوانا اب بائیں ہاتھ کا کھیل بن چکا ہے۔ اب مجرم سے پہلے پہل مہر و محبت کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ وقوعہ و واردات کے بارے میں نرمی سے پوچھا جاتا ہے۔ بالفرض کوئی مجرم سچ بتانے سے انکار کر دے تو پاپ موسیقی کی آواز کو مجرم کے کانوں کے قریب تر لایا جاتا ہے۔ بڑے سے بڑا مجرم بھی پاپ موسیقی کے صورِ اسرافیل کی قوت کو برداشت نہیں کر پاتا۔ دوسرے یا تیسرے گانے پر اس کی چیں بول جاتی ہے۔ جماہیاں لینا شروع کر دیتا ہے اور بدحواس ہو کر پورا سچ اُگل دیتا ہے۔

فلاسفۂ بدحواسی، جو فلسفی کا دماغ اور بدحواس کا دل لے کر آتے ہیں، ان کا اصرار ہے کہ بدحواسی، پاپ موسیقی اور فیس بک دانش سے کئی طرح کے مفید کام لیے جا سکتے ہیں۔ یہ حضرات، جب بھی کسی مسئلے پر سنجیدگی سے سوچتے ہیں، تو کچھ دیر کے لیے بدحواس ہو لیتے ہیں۔ بدحواسی کے ان طوفانی لمحات میں فشارِ خون کی کمی کا کوئی مریض اگر اتفاقاً ان حضرات کو دیکھ لے تو پلک جھپکتے میں کم فشارِ خون کے مرض سے نجات پا لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ قصہ اتنا عام ہو چلا کہ فشارِ خون کی کمی کے مریض انتہائی نگہداشت کے وارڈ چھوڑ کر سستے اور بے ضرر علاج کی تلاش میں فلاسفۂ بدحواسی کے پاس چلے آتے اور بھلے چنگے ہو جاتے۔ جب ان حضرات کو اپنی مسیحانہ بدحواسی کی اس خوبی کا علم ہوا تو انہوں نے ڈاکٹروں اور مریضوں کی مدد کے لیے باقاعدہ رہنما اُصول مرتب کر لیے۔ رہنما اُصول مرتب کرنا ہمارے ہاں کون سا مشکل ہے۔ سو اُصول و ضوابط یہ لکھے گئے:

اگر مریض اپنی ہسٹری شیٹ بتانے کے قابل نہ ہو تو پاپ موسیقی آن کر دی جائے، مریض لاشعوری طور پر سب کچھ بتا دے گا۔ مریض اگر فشارِ خون کی کمی کا شکار ہے تو بے ضرر قسم کے بدحواس آدمی کو مریض کے سامنے لایا جائے، فشارِ خون کی کمی مرض سے افاقہ ہو گا۔ مریض کو بے ہوش کرنے کے لیے آپریشن تھیٹر میں لے جا کر ہزاروں روپے کی مہنگی ادویات استعمال کرنے اور نشہ آور زہریلی گیس سنگھانے کی ہرگز ضرورت نہیں، نثری شاعری کی بجائے فیس بکی دانش کی چند لائنیں مریض کے سامنے گائی جائیں، یک لخت ہوش و حواس کھو دے گا۔ کیونکہ آج کل کے مریض نثری شاعری کے نشے کے عادی ہو چکے مریض کو موت کی وادی میں دھکیل سکتی ہے۔ کیونکہ (dose) ہیں۔ لہٰذا علاج سے پرہیز بہتر ہے۔ چند سطروں سے زیادہ کی ڈوز پورے شہر پر نشۂ غفلت طاری کرنے کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے۔ مریض کے ہوش و (reel) ایک مکمل فیس بک کی ریل حواس بحال کرنے کے لیے بھجن گانے یا کوئی وظیفہ آزمانے کی بھی ضرورت نہیں، مریض کو پاپ موسیقی کا کوئی ایک گیت مکمل سنایا جائے، مریض کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اُٹھ بیٹھے گا۔ ہڑبڑا کر یا بدحواس ہو کر میدانِ حشر کی طرف بھاگے گا۔ مگر فکر کرنے کی ضرورت نہیں، خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

فلاسفۂ بدحواسی اقوامِ مغرب کی طرف سے بھی غافل نہیں۔ وہ اقوام شرق کی طرح اقوام غرب کو بھی مستفید کرنے کا مکمل پلان بنائے بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میمیں سرد علاقوں میں رہتی ہیں، کہیں موسمی اثرات سے ان کے جذبات ہی سرد نہ پڑ جائیں۔ اس لیے انہیں اس جمود سے نجات دلانے کی سخت ضرورت ہے۔ مگر ان کے ارادوں پر اس وقت اوس پڑ گئی، جب انہیں کسی نے بتایا کہ وہاں تو بدحواس ہونے کے ذرائع ہی ظالموں نے مسدود کر دیے ہیں۔ چاہے آپ کتنی بار گھر سے باہر نکلیں، آپ پر گندگی کی ٹوکری کوئی نہیں اُلٹتا۔ کیچپڑ کے چھینٹے تک کوئی نہیں اُڑاتا، بلکہ کیچپڑ دیکھنے کو آدمی ترس جاتا ہے۔ خوامخواہ کوئی آپ کا راستہ نہیں روکتا۔ ہٹو، بچو کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں اور نہ ہی ہٹو، بچو کی آواز پر سرکار کی طرف سے سڑکیں بند کرائی جاتی ہیں۔ انہونی تو ہوتی ہی نہیں، ایسے میں کوئی بدحواس ہو تو کیسے ہو؟ چنانچہ بیرون ملک جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ بدحواسی میں اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

کتے

عام خیال ہے کہ ہر ذی روح میں چھوٹے، بڑے اور اشراف و کمینے کی تمیز پائی جاتی ہے مگر کتے اس سے مستثنٰی ہیں۔ وہ کتے پن کو ہی نشان امتیاز قرار دیتے ہیں۔ کتا بڑا ہو یا چھوٹا، امریکہ کا ہو یا افریقہ کا؛ بس کتا ہی ہوتا ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔

کتوں کے بارے میں عموماً ہماری معلومات سنہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں کیونکہ کتا شناسی کی روایت ہمارے ہاں کچھ زیادہ پرانی نہیں۔ یہی کوئی نصف صدی سے ہم کتوں کو جاننے اور پہچاننے لگے ہیں۔ ورنہ تاریخ میں ایسے ایسے سؤر نما کتوں کا سراغ ملتا ہے۔ جن کا کتا پن ہماری نگاہوں سے اوجھل ہی رہا۔ اس کا سبب ہماری روایتی سستی اور نااہلی کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس کا ایک اور سبب بھی ہے کہ ہم ڈر کے ماروں نے کتوں کے بارے میں طرح طرح کے خدشات پال رکھے تھے اور جب خدشات سر اُٹھا لیتے ہیں تو پھر معمولی چیز بھی غیر معمولی دشمن جیسی نظر آنے لگتی ہے۔ اس لیے اکثر ایسا ہوا کہ انسان کتوں کے سامنے بے بس نظر آیا۔ اس پر مستزاد بعض معاملات میں تو انسان کتوں کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ صرف کتوں کی بھونڈی نقل اُتار سکتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی چاہے کتنا ہی کتوں کی ہمسری کا دعویٰ کرے، کتوں کی طرح مسلسل نہیں بھونک سکتا۔

تجربات و مشاہدات سے ثابت ہو چکا ہے کہ بھونکنا کتوں کا مشغلہ ہی نہیں تجارت بھی ہے۔ کتے جانتے ہیں کہ اگر وہ بھونکنے سے باز آ گئے یا خصوصاً ان کے باجماعت بھونکنے پر پابندی عائد کر دی گئی تو کتوں کو تمام تر مراعات، مفادات حتٰی کہ آزادی تک سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ یہی سبب ہے کہ کتے اشراف اور کمینے کی تفریق کو اپنے حق میں سمِ قاتل سمجھتے ہیں۔ بلکہ اپنا دامن اَفترا پروری سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ البتہ کتیاؤں کی بات اور ہے۔ کتیائیں کبھی کبھی اپنا دامن اَفترا پروری سے آلودہ کر لیتی ہوں تو مستند معلومات کی کمی کی وجہ سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بات کتوں کی آزادی کی ہو رہی تھی۔ کتے کسی صورت گوارا نہیں کرتے کہ ان کی قوت گویائی پر پہرے بٹھا دیے جائیں۔ ایسے قوانین کو صحت مند اور بھونکنے کے عادی کتے تو ہرگز قبول نہیں کرتے۔ چاہے انہیں کتے پن کے لیے کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ کتوں سے بھونکنے کی رعایت واپس لینے کی کوششیں ایک سے زیادہ مرتبہ بُری طرح ناکام ہو چکی ہیں۔ لہٰذا شادی نہیں قبول انہیں غم قبول ہے۔ کتے موت کو بخوشی گلے لگا لیں گے مگر سناٹے کو تنہائی کے زہر میں نہیں گھلنے دیں گے۔ اس سے پہلے کہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو؛ کتے مشترکہ ہنگامہ آرائی سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ وہ منظر دیدنی ہوتا ہے جب کتے کوئی ہمہ گیر پیغام دینا چاہتے ہوں۔ کس قدر غیظ اور غصہ ہوتا ہے ان کی آواز میں۔ عقلمند کتے پیغام رسانی کے لیے ہمیشہ رات کا پچھلا پہر منتخب کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو سرِ شام ہی پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ افکار و خیالات کے اظہار میں اگر کوئی کتا ناکام ہوتا دکھائی دے تو مضافاتی کتے ازراہِ ہمدردی اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تبادلۂ خیالات کے ذریعے مشکل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی کتا نا سمجھی کا مظاہرہ کرے تو ناہنجار کتے کی سرزنش بھی کی جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسی تو تو میں میں سے ماحول کشیدہ بھی ہو جاتا ہے اور نوبت باہمی جنگ و جدل تک جا پہنچتی ہے، آخر کتے ہیں۔ مگر حالت جنگ میں بھی کتا پن دستبردار نہیں ہوتے۔ پیروئ حضرت انسان کو پہلے بھی اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے تھے اور حالت جنگ میں بھی ننگ و عار ہی جانتے ہیں۔ اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں۔ کتے میدان جنگ کے لیے مناسب مقام کا انتخاب کرتے ہیں، نہ فوج ظفر موج کا اہتمام کرتے ہیں، نہ کوئی منصوبہ بندی، نہ دھڑے بندی، نہ

تالے بندی، بس اچانک ہی فادات پھوٹ پڑتے ہیں۔ جس طرح کوئی آتش فشاں اچانک لاوا اگلنا شروع کر دے ۔ مگر ذرا سی دیر میں جنگ کے بادل چھٹنے لگتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ کوئی پوچھے کہ اگر جنگ کو طول نہیں دے سکتے تھے تو جھگڑا ہی کیوں کیا تھا۔ تو کتوں کا عجیب فلسفہ سامنے آتا ہے کہ لڑنا ان کا مقصد حیات نہیں بلکہ حق ذات ہے۔ لڑنا جن کا مقصد حیات ہوتا ہے وہی جنگوں کو طول دیتے ہیں۔

چنانچہ کتوں کے فادات ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک شہر سے دوسرے شہر کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتے۔ کیونکہ کتے فادات پھیلانے کی صلاحیت ہی سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ اعزاز صرف حضرت انسان کو حاصل ہے کہ فادات کی آگ کو ایک شہر سے دوسرے شہر اور دوسرے شہر سے دوسرے ملک اور دوسرے ملک سے پوری دنیا میں پھیلا سکتا ہے۔ یقیناً کتے اپنی کم عقلی اور نافہمی پر ابنِ آدم سے حسد کریں تو اور بات ہے۔ ورنہ جنگ و جدل اور فساد و فسق میں کتے انسان کا ہم پلہ نہیں۔ کتوں کو انسان کی پوشیدہ و آرمیدہ صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہیں۔ باہمی احترام باقی رہے تو بہتر ہے ورنہ جنگ کی صورت میں کتوں کی شکست یقینی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تاوان جنگ کے لیے کتوں سے سوائے خدمات کے اور کچھ لیا بھی نہیں جا سکتا۔

کہتے ہیں کتوں کے درمیان اگر کسی بات پر شکر رنجی ہو جائے اور کچھ کتے مل کر کسی نامراد کتے پر پِل پڑیں اور وہ کتا اعلان شکست کے طور پر اپنے دانت نکال کر کھڑا ہو جائے تو حملہ آور کتے فوراً حملہ روک دیتے ہیں۔ یہ کتا پن ہی تو ہے کہ ذرا سی بات پر کتوں کی انا کی تسکین بھی ہو گئی۔ شکست خوردہ کتے سے اظہار تاسّف ہونے لگا۔ پُر امن مذاکرات نے صلح صفائی کی راہ بھی دکھا دی۔ مگر ہمیں دیکھو، دشمن کا سات سمندر تک پیچھا کرتے ہیں اور پھر سات سمندر پار تو امریکہ ہے، کینیڈا ہے اور نا معلوم کیا کچھ ہے۔ جہاں سینکڑوں ماہرین حیوانات کتوں کی عادات و خصائل پر تحقیق کر رہے ہیں تا کہ کتوں کو اُن کا جائز اور آبرومندانہ مقام دلا سکیں۔

اگرچہ کتے ماہرین حیوانات کی ہر طرح کی تحقیق کو ماننے سے صاف انکاری ہیں۔ مگر حسنِ ظن رکھنے میں کیا حرج ہے۔ وہ یہ کہ آہستہ آہستہ کتوں کے کتا پن میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کتوں نے بہت سے پیشوں کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ مثلاً "کتوں نے تنہا گانے کی روایت سے منہ موڑ لیا ہے۔ البتہ کبھی کبھی کورس کی شکل میں ضرور گا لیتے ہیں۔

یوں بھی ہر معاملے میں کتوں کی رضامندی ضروری بھی نہیں۔ چنانچہ ہم اپنی سہولت کے لیے کتوں کو درج ذیل قسموں میں تقسیم کر رہے ہیں تا کہ کتوں کو پہچاننے میں آسانی رہے۔ کتوں کی تقسیم کچھ یوں ہو گی: آوارہ گرد کتے، صحرا نورد کتے، چالاک کتے، عیار کتے، بے روزگار کتے، برسرِ روزگار کتے، خاموش طبع کتے، اور مکمل کتے۔

قیاس کریں جب یورپ میں کتا شناسی کی تحریک شروع ہوئی تو ہماری طرف سے حسبِ معمول بے جا شکوک کا اظہار کیا گیا۔ یورپی دانشوروں کا مذاق اڑایا گیا۔ مگر وہ اس مشکل گھڑی میں ثابت قدم رہے۔ نتیجہ یورپ کے حق میں نکلا۔ یورپ نے کتا شناسی کی عظیم روایت کی بدولت کتوں کے حق اور حقیقت کو پہچان لیا۔ مگر مشرق میں بالخصوص اور ہمارے ہاں بالعموم کتا پرستی کی روایت پوری طرح جڑ نہ پکڑ سکی۔ وجوہات خواہ کچھ بھی ہوں ہم کتا شناسی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ لے دے کے ہمارے پاس چند نام ہیں جنہوں نے کتا شناسی کے حوالے سے کچھ خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس کے برعکس یورپین دانشوروں اور اہل علم کو دیکھو؛

تاریک دور سے قوم کو نکالنے کا واحد حل کتا شناسی میں دریافت کیا۔ آج یورپ میں جسے دیکھو؛ کیا بوڑھا، کیا جوان، مرد و زن ، فخر سے سینہ پھلائے، گردن اٹھائے، کتا بغل میں دبائے یا سینے سے چمٹائے، سڑکوں یا پارکوں، باغوں، گھروں اور سکولوں میں بیٹھے ہیں۔ حتٰی کہ سیمیناروں میں بھی کتوں کے بغیر شرکت نہیں کرتے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں تنگ نظری اور رجعت پسندی کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی سگ پرست کسی تقریب میں کسی کتے یا کتیا کا بوسہ بھی لے لے تو ہنگامہ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ واہ رے یورپ والو! تمہاری مساعی جمیلہ ہی سے حق بحقدار رسید ہوا۔ تمہاری روشن خیالی کی داد نہ دینا بخل کی دلیل ہو گی۔ یہ یورپ ہی تو ہے جہاں بے اولاد جوڑے کتوں کو گود لے رہے ہیں، متبنٰی بنا رہے ہیں، کتوں کو غسل دیا جاتا ہے، نہلایا جاتا ہے، جس کا تصور بھی مشرقی دنیا میں محال ہے۔

ہماری مشرقی دنیا "میمیائے" کتوں کے کام سے تو در کنار نام سے بھی کم ہی واقف ہو گی۔ یہ وہی کتے ہیں جن کی شہرت یورپ کی حدود پھلانگ کر برصغیر تک آن پہنچی ہے۔ مگر میمیائے کتے کی سیر چشمی کی داد دینا پڑتی ہے کہ گھر کی چار دیواری بھی کبھی نہیں پھلانگی۔ ایسا قابلِ رشک ماحول، میمیں ہیں کہ کتوں پر قربان ہو رہی ہیں اور کتے ہیں کہ میموں کے گرد گھوم رہے ہیں اور وہ بیٹھی خوش ہو رہی ہیں۔ جی چاہا تو کتے پر دستِ شفقت پھیر لیا۔ جی میں آیا تو اظہار محبت کرنے لگیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ کردار اور نصیب اپنا اپنا ہوتا ہے۔ نصیب کی بات ہی تو ہے کہ ایک طرف تو کتے گھریلو اور نسوانی معاملات سے عہدہ برآ ہونے کے بعد اُمورِ مملکت کی انجام دہی تک کا سوچ رہے ہیں اور ہمارے کتے ہیں یعنی مقامی کتے کہ انہیں آوارہ گردی سے ہی فرصت نہیں۔ البتہ صحرا نورد کتوں کی بات کچھ اور ہے۔ صحرا نورد کتے، عاشقِ صادق کی تمام خصوصیت کا جامع نظر آتے ہیں۔ جو اپنی دُھن میں مگن دنیا و مافیہا سے بے خبر اَن دیکھی دنیا اور محبوباؤں کی تلاش میں خاکِ صحرا چھانتے پھرتے ہیں۔ یہ کتے بڑے شریف النفس اور وضعدار واقع ہوئے ہیں۔ اگر کوئی ان کا راستہ روک لے تو بے چون و چرا یہ وادی بھی ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا، کہتے ہوئے راستہ بدل لیتے ہیں۔

دوسری طرف آوارہ گرد کتے ہیں جو عادات و خصائل کے اعتبار سے ہوس پرستوں میں گنے جاتے ہیں۔ اور چھچھوری حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ دعویٰ حسن پرستی سے انا کی تسکین کرتے پھرتے ہیں۔ یہی وہ کتے ہیں جن کو خدائی خدمتگار کہہ دیا جائے تو برا نہیں مانتے بلکہ دُم ہلاتے ہوئے آتے ہیں۔ انہوں نے بلا معاوضہ گھروں، گلیوں اور محلوں کی چوکیداری کا منصب سنبھال رکھا ہے۔ اِدھر شام ہوئی، اُدھر انہوں نے کسی تھڑے پر قبضہ جما لیا۔ گلی میں سے گزرنے والوں پر برابر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ آپ اسے نگاہِ بد سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ اگر اِدھر اُدھر نگاہ پھسل جائے تو معذرت خواہانہ انداز میں نیم غنودگی کی کیفیت میں چلے جاتے ہیں۔ گویا زبان معذرت سے کہہ رہے ہوں، لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر ہے کیا کیجے۔ مگر اس طرح کہ آنے جانے والوں کو گمان بھی نہ گزرے کہ کیوں بیٹھے ہیں اور کب سے بیٹھے ہیں۔ سیاحت گھٹی میں پڑی ہے۔ مشربِ بے نیازی ہے، جو کبھی کبھی حد سے گزر جائے ہے تو حال دل بھی نہیں سناتے۔ مگر دنیا سے لاتعلق ہرگز نہیں، دکان کا تھڑا ہو یا کوئی ویران چبوترا، رات کو جب سارا جہان سو رہا ہوتا ہے تو دنیا کے پیچیدہ مسائل کے بارے میں، ظلم و ناانصافی کے خاتمے کے لیے بحث و مباحثوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ انقلاب کے منصوبے بناتے ہیں۔ مگر جیسے ہی رات کا پردہ سمٹنے لگتا ہے یہ بھی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر کونوں کھدروں میں جا بیٹھتے ہیں۔

رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے زندگی بسر کرنے والے آوارہ گرد کتے رنگینیوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ امیرانہ مزاج کی بدولت کبھی تو قصاب کی دکان پر دھونی رمائے بیٹھے ہیں اور کبھی رات کو چوراہے کا کنٹرول سنبھالے مستعد پولیس کانسٹیبل کی طرح کاشن دے رہے ہیں۔ سمجھدار ان کا کاشن سمجھ کر راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔ بے وقوف منہ اُٹھائے چلے آرہے ہیں۔ اور یوں سزا کے مستحقین میں نام درج کرا رہے ہیں۔ کبھی تو آوارہ گرد کتے منصب و اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے پولیس انسپکٹر کے فرائض سنبھالنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ نیند یائے ہوئے پولیس والوں کو جگانا ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ذرا سی قریب ہوئے، اُدھر اصلی پولیس مین نے لیفٹ رائٹ شروع کر دیا۔ حد تو یہ ہے کہ کوئی چور انہیں بھتہ دیے بغیر ان کے علاقے سے نہیں گزر سکتا۔

بھتہ مل جانے پر یہ خاموش کتے کا منصب سنبھال لیتے ہیں۔ آپ اچھی طرح جان چکے ہوں گے کہ کتوں کی یہ قسم کچھ کم خطرناک نہیں۔ یہ آپ کے سامنے آکر دوستی جتائے گا، ہلکا سا مسکرائے گا، سر کو جھکا کر، باادب بن جائے گا؛ آپ اس کتے کو احترامِ حیوانات کے جذبے کے تحت سوّلائیزڈ کتے کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اپنے مہذب پن کی بدولت شادی بیاہ کی تقریبات میں بھی شرکت کرنے لگے ہیں۔ خاموشی سے آئے دعوت ولیمہ میں دولہا کے قریب ہو بیٹھے۔ دلہا نے تھوڑا سا التفات برتا تو اور قریب ہو بیٹھے۔ مگر ذرا سا خطرہ محسوس ہونے پر دُم دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ انہیں دم دبائے کتے کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ کتوں کی بہت سی قسمیں ابھی باقی ہیں جن کی تفصیل ہم کتوں کے خوف سے نہیں لکھ رہے۔ آپ ہوتے تو آپ کا قلم بھی قدم قدم پر رکتا۔ اِدھر اُدھر خوفزدہ نظروں سے آپ بھی دیکھتے۔ کتوں سے جان کی امان طلب کرتے۔ یار زندہ صحبت باقی اگر آپ، ہم اور کتے باقی رہے تو غیر معروف کتوں کا تعارف بھی حسب منشائے سگ دوستاں کرا دیں گے۔ البتہ ضروری ہے کہ کتوں کی من جملہ خصوصیات کا مجموعی طور پر ذکر کر دیا جائے۔

عام خیال ہے کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام اور ایسے خیال عموماً صحیح ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک خیال ہے کہ دو کتے مل کر نیند حرام کر دیتے ہیں۔ نیند کس کی اور کتنوں کی حرام ہوتی ہے اس کے لیے ہمیں کتے کے قد کاٹھ پر غور کرنا ہوگا۔ قد کاٹھ سے مراد یہ کہ کتا کتنا مؤثر اور مانا ہوا کتا ہے۔ پھر یہ بات بھی تو غور طلب ہے کہ کتے نے کوئی پارٹی تو تشکیل نہیں دے رکھی۔ اگر کتا کسی جماعت کا لیڈر رہے تو پارٹی کے زور پر پورے ملک کی نیند حرام کر سکتا ہے۔ بالفرض اس کے پاس تنخواہ دار کتے بھی ہیں تو رہنما کتا جب چاہے جس کی چاہے نیند حرام کر سکتا ہے۔ یہ تو کتے کی شرافت، نجابت، اثر و رسوخ اور سیاسی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کتوں سے کیا کیا اور کتنا کام لیتا ہے۔ خصوصاً بے روزگار اور برسرِ روزگار کتوں کو کیوں کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یعنی میدانِ عمل میں جھونک سکتا ہے۔ البتہ ہڈی کے حصول کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں کارکن کتوں کو ہر لمحے یہ احساس دلایا جانا ضروری ہے کہ غریب کتوں کو بھی لعنت، ملامت، پھٹکار اور دھتکار سے نجات ملنے والی ہے اور آنے والا کل غریب کتوں کا ہے۔ کل سے مُراد کل کا دن نہیں ہے۔ ایسا سمجھنے والے خوامخواہ مایوسی کا شکار ہوں گے۔ وعدے وعید سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔ عوامی مزاج کتے تو بغیر کسی تردد کے دُم ہلاتے چلے آئیں گے۔

مُسکرانا

مُسکرانا فعلِ عبث نہیں، فعلِ حرام نہیں، کیونکہ حرام کا منہ کو لگنا اچھا نہیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ حلال و حرام کی تفریق کے بغیر مُسکرایا جائے۔ اگر مسکراہٹ کو فعلِ نادان کہیں تو نادان کا کوئی بھی فعل، قابلِ گرفت ہی نہیں ہوتا۔ مسکراہٹ کو فعلِ شیطان کہنا بھی تو ٹھیک نہیں۔ البتہ قہقہے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مُسکرانا قابلِ تعزیر جرم بھی نہیں مگر مغربی معاشرے میں۔ مُسکراہٹ تو خودرَو سبزے اور پھول کی مانند ہے جس میں تازگی اور طراوت ہوتی ہے۔ اسے دانستہ افعال کے زمرے میں ڈالنا ٹھیک نہیں۔ مگر کیا کیا جائے، جس کا کوئی ولی، وارث نہ ہو اسے کسی کے پلّو سے بھی باندھ دیا جائے، کسی کے کھاتے میں ڈال دیا جائے، کون پوچھتا ہے۔ لہٰذا زیادہ باریکی میں جانا اور مسکراہٹ کو فن و فلسفے کا درجہ دینا عام آدمی کی ضرورت ہی نہیں۔ یوں بھی ہم بہت سی باتوں اور گھاتوں کو جاننے کی کوشش کریں تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہمیں نہیں معلوم بندر مسکرانے کی بجائے چڑاتے کیوں ہیں؟ جب گدھے آپس میں ملتے ہیں تو مُسکراہٹ کا تبادلہ بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ بچے کھیلتے ہیں تو کُودتے کیوں ہیں؟ بوڑھے جھگڑتے ہیں تو آخر کس سبب سے۔ قائی میں قَساوت کیوں ہوتی ہے؟ دکاندار میں لگاوٹ کیوں ہوتی ہے؟ کہانی میں کَساوت کیوں ہوتی ہے؟ پھر ہمیں یہ بھی تو نہیں معلوم کہ جب فرشتے مسکراتے ہیں تو اس وقت شیطان اور اس کے چیلوں چپاٹوں پر کیا گزرتی ہے یا پھر یہ کہ فرشتوں کی مسکراہٹوں میں ان کی باطنی خوشی بھی شامل ہوتی ہے یا طنز کی زہرناکی۔ پھر ایک اور سوال جنم لیتا ہے کہ فرشتوں کی مسکراہٹ کبھی قہقہے میں بھی تبدیل ہو پاتی ہے یا صدائے محجبور کی طرح گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ اور جب شیطان اپنے چیلوں کی کامیابی پر فاتحانہ قہقہہ بلند کرتا ہے تو اس لمحے فرشتوں کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوتا کہ فرشتے شیطان کے قہقہوں پر خاموش تماشائی کی طرح بت بنے کھڑے رہتے ہیں یا کچھ کر گزرنے کا سوچتے ہیں؟ اور فرشتوں کے بارے میں تو سنا ہے کہ فرشتے جذبات اور ذاتی کردار سے عاری مخلوق ہیں۔ زمین و آسمان میں خواہ کتنے ہی انقلاب کیوں نہ آجائیں وہ مظاہرِ قدرت کی طرح اپنی ڈیوٹی پر مامور رہتے ہیں۔ دنیا کچھ کی کچھ ہو جائے، ان پر غزل کے محبوب کی طرح کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ سامنے ہی نہیں آتے، ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ فرشتے تو پاکیزہ اور نوری مخلوق ہوتے ہیں وہ ہنستے تھوڑی ہیں۔ بھلے وقتوں کی بات ہے جب مسکراہٹ کو اِفادی فن کا درجہ حاصل نہ ہوا تھا، مسکراہٹوں سے اقتصادی اور ازدواجی اُمور نہیں نمٹائے جاتے تھے اور انسان بھی فرشتے نہ ہوتے تھے۔ صرف انسانیت اور آدمیت پر فخر کرتے تھے۔ اب ہم گلہ کرتے ہیں کہ کوئی مسکراتا نہیں، کوئی قہقہہ نہیں اُبھرتا، کوئی کسی کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتا، کوئی کسی کا ہاتھ نہیں بٹاتا، کوئی لُٹتا رہے، کوئی پٹتا رہے، کسی کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی، بات مسکراہٹ کی ہو رہی تھی کہ ہم کہاں سے کہاں تک جا پہنچے۔ مسکراہٹ کے بارے میں ایک دانشور کا کہنا ہے کہ مریضانہ رویے کا نام ہے۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہنس رہا ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی رونے کی مشقت میں مصروف ہے۔ اس کے برعکس قہقہہ نعرۂ مستانہ ہے۔ مسکراہٹ فسوں ہے، قہقہہ جوشِ جنوں ہے، مسکراہٹ ٹھہرا پانی ہے، قہقہہ دریا کی روانی ہے، مسکراہٹ میں طنز کی زہرناکی ہوتی ہے، قہقہے میں لہجے کی بے باکی ہوتی ہے۔ آپ مسکراہٹ کو کلاسیکی شاعری اور قہقہے کو آزاد نظم یا اس کی نومولود بہن نثری نظم سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کلاسیکی شاعری میں، جس رکھ رکھاؤ اور سلیقہ مندی، بحر کی پابندی اور حزم و احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے آپ غمگین مسکراہٹ کا نام دے سکتے ہیں۔ اور آپ تو جانتے ہیں مسکراہٹ میں ایمائیت ہوتی ہے، اشاریت ہوتی ہے، اعجاز ہوتا ہے، اختصار ہوتا ہے،

نہیں ہوتا تو حقیقت کا واشگاف اظہار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نظم قہقہے اور نثری نظم بے ہنگم قہقہے کی مانند ہے، مسکراہٹ میں اعضاء کا توازن نہیں بگڑتا، مسکراہٹ میں کسی عضوِ ضعیف کا خفیف سا فرق بھی نظر نہیں آتا۔ نہ آنکھ بند ہوتی ہے، نہ منہ کھلتا ہے، نہ زبان باہر نکلتی ہے، نہ ہاتھوں میں کپکپاہٹ، نہ دانتوں میں کٹکٹاہٹ، لیجیے مسکراہٹ ختم ہوئی۔ اب قہقہے کو دیکھیے، آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں، ہاتھ حرکت کر رہے ہیں، آدمی ہے کہ خود بخود جھول رہا ہوتا ہے، جبڑے یوں کھُلتے اور بند ہونے کے قریب آتے ہیں، جیسے آزاد نظم کی سطریں یکایک طویل اور مختصر ہونے لگتی ہیں۔ پھر ایک مسلسل کھے کھے ہے ہے۔ آپ چاہیں تو نثری نظم کی طرح اس میں آہنگ بھی ڈھونڈ سکتے ہیں اور ڈھونڈنے سے کیا نہیں ملتا۔ مسکراہٹ سچی ہو تو آسان، آپ دفتر میں مسکرا سکتے ہیں، دفتر سے باہر، گھر میں، گھر سے باہر، بازار میں چوک میں، سرِ راہ مسکرائیں، کوئی رکاوٹ نہیں، کوئی نہیں پوچھے گا کہ آپ کیوں مسکرائے البتہ آپ ایک لمحے کے لیے بھی بازار یا دفتر میں رو نہیں سکتے۔ اِدھر آپ نے رونا شروع کیا اُدھر لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے، کوئی اطمینان اور تسلی سے رونے بھی نہیں دیتا۔ یا پھر آپ کا قہقہہ بلند ہوا بھرے بازار میں، آپ نے ایک نہیں بلکہ دو چار قہقہے بلند کیے، لوگوں کی بد ذوقی تو دیکھو، کوئی آپ کو دیوانہ سمجھ رہا ہے، کوئی مالیخولیا کا مریض سمجھ کر پ ٹھی پ ٹھی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ بچے بالے بھی بغور آپ کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے ہیں، ہر بام و در پر نازنینوں کا ہجوم ہے، سوچوں کے دھارے ہیں کہ سیدھے دل سے ٹکرا رہے ہیں۔ دوسری طرف مسکراہٹ کی بے اثری تو دیکھو کہ آپ سارا دن مسکراتے پھریں، کسی کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسکراہٹ معصوم اور خود اختیاری جذبے کا نام ہے، تو قہقہہ بے اختیاری کیفیت ہے۔ مسکراہٹ میں خودی اور خود نگری پنہاں ہوتی ہے، تو قہقہے میں بے خودی ہوتی ہے۔ مسکراہٹ میں ناز و انداز پوشیدہ ہوتا ہے، جبکہ قہقہہ اِرد گرد سے حد سے گزری ہوئی بے نیازی کا نام ہے ۔ مسکراتے ہوئے اِرد گرد سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا، یہ دیکھا جاتا ہے کہ محفل میں شریک لوگوں کی موجودگی میں مسکرانا بھی ہے یا نہیں۔ یہی سبب ہے کہ عالم اور عام کی معافی اور مسکراہٹ میں فرق ہوتا ہے۔ عامہ کو تو علم ہی نہیں ہوتا کہ بعض بعض مقامات اور مواقع پر مسکرانا خطرے اور خبث سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ مسکراہٹ میں کیا کیا مصلحتیں اور مصیبتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ مسکراہٹ کی حقیقیت سے تو عالم ہی آگاہ ہوتا ہے۔ وہ اہلِ دول کی طرح مسکراہٹ کو باقاعدہ فن کا درجہ دیتا ہے۔ مثلاً یہ تو عالم ہی جانتا ہے، نیم تنہائی میں کم مسکرانا چاہیے، غسل خانہ نہانے کی جگہ ہے ، مسکرانے کی نہیں۔ بزرگوں کی صحبت میں یا تو مسکراتے رہیں یا استغفار کرتے رہیں۔ ورنہ بزرگوں کی عادتیں، اور عادات کسی کی بھی ہوں قابلِ گرفت نہیں ہونی چاہیں۔ ہمائیوں سے مسکرا کر بات کرنے سے رُعب جاتا رہتا ہے۔ دوستوں سے مسکرا کر بات کرنے سے شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں اور کسی بھی شے کا جنم لینا خطرے اور خرابی سے خالی نہیں ہوتا۔ بیوی سے مسکرا کر بات کرنے سے گریز کریں ورنہ بیوی اور بہو کا فرق باقی نہ رہے گا۔ اگر کہیں خطاب کرنے کا موقع ہاتھ آئے تو غضب ناک ہو جائیں، قہرِ الٰہی بن جائیں، شعلۂ جوالا بن جائیں، طوفانِ بلاخیز کی صورت اختیار کر لیں ہرگز ہرگز نہ مسکرائیں۔ ان بھیدوں سے گھر کے بھیدی کے سوا کوئی پردہ نہیں اٹھا سکتا۔ اور وہ ایک عالمِ الم رسیدہ کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

بھلائی کے خواب

مسلسل خواب دیکھنا یا ہر وقت خوابیدہ حالت میں رہنا تو شاید قابل گرفت ہو مگر بھلائی کے خواب دیکھنا اور جیتی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا تو کچھ قابل اعتراض نہیں۔ خصوصاً اُس وقت جب معاشرہ اور بُرے خواب دیکھنے والے بُری طرح گمراہی، ابتری، انتشار، کاہلی اور بے خوابی کا شکار ہو چکے ہوں تو ایسے میں معاشرتی فلاح کے لیے بھلائی کے خواب نہ دیکھنا بہت ہی معیوب اور شرمناک بات متصوَّر ہو گی۔ وہ لوگ جو خواب دیکھ سکتے ہیں، خوابوں کے لیے لڑ سکتے ہیں یا خوابوں کے لیے لڑا سکتے ہیں اگر خواب نہیں دیکھیں گے تو قومی گمراہیوں کے سلسلے شدید تر ہوتے چلے جائیں گے۔ شاید اسی لیے ہر ملک کے قومی رہنما لوگوں کو خواب سپہ خواب دکھاتے ہیں تاکہ خواب پسند لوگ بے خوابی اور گمراہی کا شکار نہ ہو جائیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے، خوابوں کے سراب میں سرپٹ دوڑنے والے ہمیشہ فائدے میں رہتے ہیں۔ اوّل تو قومی بھلائی کے خواب دکھانے والے عوام الناس کو ڈراؤنے خوابوں سے دور رکھتے ہیں تاکہ بھوک پیاس سے بلبلاتے بچے ڈراؤنے خواب دکھانے والوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ خوابوں کے پیچھے دوڑنے والے بھاگ دوڑ کی اہمیت سے خوب واقف ہو جاتے ہیں۔ تیسرا، خوابوں کے لیے لڑنے جھگڑنے کی عادت، فتنہ و فساد کا عادی بنا دیتی ہے۔ یوں خوابوں کے رسیا خود کو ہر بڑے فساد کے لیے ہمہ وقت تیار پاتے ہیں۔ چوتھا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ خوشنما خوابوں کی تعبیر کے لیے زحمت انتظار اُٹھانے والے آئندہ زندگی میں عشق کے پیچیدہ معاملات میں انتظار کی مشقت سے کسی طور نہیں گھبراتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی مہذب یا غیر مہذب ملک میں کوئی عاشق ایسا نہ ملے گا جس نے عشق کے روگ سے پہلے خواب نہ دیکھے ہوں۔ علاوہ ازیں ان خوابوں میں ہمیشہ وعدوں کی گٹھڑی ہوتی ہے، جسے آپ جب کھولیں گے اس سے خواب ہی برآمد ہوں گے۔ چنانچہ آپ جب چاہیں، ان حسین خوابوں کو عزیز و اقارب، دوست، احباب اور ملنے والوں میں مفت تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان خوابوں کے خریدار اپنی مالی اور معاشی حالت سنوارنے کے لیے اگر جوگی، فقیر اور درویش بننا چاہیں تو انہیں اپنے ہم کاروں پر ہر زماں میں سبقت حاصل رہے گی۔ پھر یہ روایتی خواب، ہمیں ریاست، سیاست اور مذہب کے معاملات میں پیٹ بن کر نہیں رہنے دیتے۔ ایسے خواب دلیل شہرت کے طور پر دیکھے اور ازراہِ غریب پروری دکھائے جاتے ہیں، تاکہ شام و پگاہ، مصائب و آلام میں مبتلا اور حصولِ رزق کی بھاگ دوڑ میں خرچ ہو جانے والے لوگ خوابوں کے جھنجھٹ سے آزاد ہو جائیں۔ تصور کریں کہ ہمارے رہنما اگر قومی بھلائی کے خواب دیکھنے اور دکھانے میں مستعدی نہ دکھاتے تو ہمارا حال بھی اُن قوموں جیسا ہوتا جو صدیوں سے خوابوں سے محروم چلی آ رہی ہیں۔ جن قوموں کو بھلائی کے خواب دیکھنے والوں کی معقول تعداد میسر نہیں۔ اگرچہ اُن کی صنعتیں تو خوب پیداوار دے رہی ہیں مگر وہ خواب برآمد کرنے سے مکمل معذور ہیں۔

مشرق و مغرب میں ہمیشہ سے یہی دستور چلا آتا ہے کہ طبقۂ اشرافیہ ہی کو قومی بھلائی کے خواب دیکھنے کا اہل سمجھا جاتا رہا ہے کیونکہ عام آدمی تو سلیقے سے رو بھی نہیں سکتے۔ بلکہ رونے کے فن اور آداب سے ناآشنا قومیں جب رونے کی حرکت کی مرتکب ہوتی ہیں تو اہلِ عشق کی چشمِ پُرنم پر قیامتیں گزر جاتی ہیں۔ رونا کوئی اہلِ مشرق سے سیکھے۔ مشرقیت کا سارا حسن چپکے چپکے آنسو بہانے میں چھپا ہے۔ مغرب میں جو کام سفارت کار، سپہ سالار اور فوجیں سرانجام نہیں دے سکتیں؛ مشرق میں وہی کام گرم گرم آنسوؤں کی بدولت ممکن بنا لیا جاتا ہے۔ آنسو بہانا اور بہانے بہانے سے آنسو بہانے میں بڑا فرق ہے۔ کسی کی

موت پر آنسو بہانا اور کسی کی موت کے لیے آنسو بہانا، دو مختلف رویے ہیں۔ ایک سے ماضی کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ تو دوسرے سے زمانۂ حال کی زیادتیاں۔ اہلِ مغرب کیا جانیں کہ خوابوں کے زمانے اور آنسوؤں کے نذرانے میں کیا کیا راز پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک کائنات کا راز عیاں میں ہے، ہمارے نزدیک کائنات کا راز نہاں میں ہے۔ اگر ہمارے ہاں اقدار سے لے کر عقیدت تک ہر شے پردہ پوش ہوتی ہے تو مغرب میں ہر شے آہن پوش ہوتی ہے۔ البتہ نقاب پوش دونوں جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارا ہر خواب، خواہش کے لیے پردے کا کام دیتا ہے۔ ہم جب تک خواہش کو خواب کا لباس نہ پہنا لیں، خود کو اسیرِ آرزو سمجھتے رہتے ہیں۔ مگر اہلِ مغرب کا آہن پوش دماغ کڑے پہرے میں ہونے کے باعث جنوں خیز خوابوں کا مسکن نہیں بن پاتا۔ چنانچہ اُن کی خواہشیں خوابوں کے بھڑکیلے، نرم اور ملائم لباس سے ناآشنا ہی رہتی ہیں۔ یہ اہلِ مغرب کی سنگ دلی اور قطع رحمی نہیں اور کیا ہے کہ وہ اولاد کے لیے بھی خواب خریدنے کو تیار نہیں ہوتے۔ ایک ہم ہیں کہ اپنی عاقبت خراب لیتے ہیں مگر اپنی اولاد کی خوابوں کی دنیا خراب نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی قومی بھلائی کے خواب دیکھنے سے باز آتے ہیں۔ اُن بیچاروں کو کیا معلوم کہ آہن پوش مشینیں سنہرے اور روپہلے خواب بُننا بھی چاہیں تو نہیں بُن سکتیں۔ صرف عقل پر کار ہی سنہرے خواب اور سنہرے جال بُن سکتی ہے۔

مغرب سے ہماری ناراضی کا یہ سبب نہیں کہ انہوں نے سردی کو گرمی میں اور گرمی کے موسم کو یخ بستہ موسم میں بدل دیا ہے۔ بس ان کی عادتوں اور ہماری ضرورتوں نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ پہلا سبب یہ کہ ایک تو عرصے سے اہلِ مغرب نے قومی بھلائی کے حسین خوابوں کی صنعت ہی بند کر دی ہے۔ دوسرا وہ خود کو کتوں کے پیار تک محدود رکھتے تو قابل برداشت تھا مگر انہوں نے تو کتیاؤں کو مادر پدر آزادی دے کر آوارہ گردی کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اب یہ کتیائیں اور کتے چاروں اور بھونکتے پھرتے ہیں۔ کتیاؤں کی یلغار سے ڈر کر کتوں نے دبک کر کیا بیٹھنا تھا، وہ تو کتیاؤں کے پیچھے پیچھے ہو لیے ہیں۔ ان آوارہ خرام کتیاؤں کی وجہ سے سبز باغوں کی دنیا تو آباد ہے مگر قومی بھلائی کے خوابوں کی دنیا اُجڑ گئی ہے۔ کتوں کی کارستانیاں دیکھ کر گدھوں نے بھی کان کھڑے کر لیے ہیں۔ گدھوں کی تعداد اگرچہ لاکھوں سے متجاوز ہے، مگر گدھے عموماً ہنگامہ آرائی نہیں کرتے اور خوابوں کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں بنتے۔ جہاں جگہ ملے بیٹھ جاتے ہیں۔ جو کھانے کو ملے کھا لیتے ہیں۔ جہاں کھڑا کر دو، کھڑے کے کھڑے رہتے ہیں۔ ہر طرح کی مشقت کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ پہاڑوں پر بار برداری کا کام بھی انہی سے لیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس امپورٹڈ کتے اور کتیائیں، ان کے نخرے اور چونچلے ہی ختم نہیں ہوتے۔ ایک تو راتب کے لیے امریکہ، برطانیہ اور جرمنی کے خواب دیکھتی ہیں۔ نچلا بیٹھنا ہی نہیں آتا۔ بن سنور کر بازاروں اور چوراہوں پر ہر آتے جاتے کو للچائی نظروں سے دیکھتی رہتی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ کہاں قومی بھلائی کے خواب اور کہاں کتوں کا ذکر خانہ خراب۔ اسی لیے ثقہ حضرات بضد ہیں کہ ہر آدمی کو قومی بھلائی کے خواب دیکھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے ورنہ خوابوں کا اعتبار اور وقار جاتا رہے گا۔ پھر بغیر منشور کے خواب دیکھنا بھی تو پھوہڑ پن کی دلیل ہے۔ اگرچہ ہر منشور عوام کے لیے ہوتا ہے، مگر منشور عوام کے سامنے رکھنا مناسب نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جو چیز عوام کے سامنے رکھی جائے وہ یا تو چوپٹ ہو جاتی ہے یا چٹ ہو جاتی ہے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو عوام کے لیے کچھ بھی نہ رکھا جائے۔

ہر کام کا ایک قاعدہ اور قانون ہوتا ہے۔ یونہی الل ٹپ خواب دیکھنے کی بجائے اہداف کا تعین اور شدھ گھڑی کا انتخاب کر لیا جائے تو اچھا ہے۔ اگر خدانخواستہ خواب دیکھنے کی ابتدا ئیک ساعت سے نہ کی جائے تو بدشگونی کے سائے قومی بھلائی کے خوابوں کی تعبیر کو اُلٹ دیتے ہیں۔ کتنے ہی ممالک ایسے ہیں جو نیک ساعت میں آزاد نہیں ہوئے، وہ اب تک داخلی اور خارجی کی بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ جنگ و جدل سے اُن کی جان ہی نہیں چھوٹ رہی۔ اسی طرح بہت سی مائیں اپنے بچوں کی پیدائش کے لیے نیک ساعت کا خیال نہیں رکھتیں۔ اکثر جلد بازی سے کام لیتی ہیں۔ نتیجہ زچہ بچہ کے حق میں کبھی اچھا نہیں نکلتا۔

دوستو! ہوشیار رہنا، کہیں ہم بھی جلد بازی میں، نسیان کا شکار نہ ہو جائیں۔ کہتے ہیں، افتتاحی تقریب کے بغیر قومی بھلائی کے خواب دیکھنا، حُب الوطنی کے تقاضوں کے منافی ہوتا ہے۔ چنانچہ حب وطن کا تقاضا یہ ہے کہ افتتاحی تقریب وطن کے شایانِ شان ہو۔ جس میں وزرا، اُمرا، صنعتکار، سرمایہ دار، تجار سمیت ہر قبیل کے اہم لوگ ہونے چاہیں۔ کل کلاں قومی بھلائی کے خوابوں کو انہی کے ذریعے ہی تو پذیرائی ملے گی۔ یہ حصولِ شہرت کا موقع نہیں بلکہ قومی عزت و غیرت کا سوال ہے۔ ملک کے تمام نامور فنکاروں کو خصوصی طور پر مدعو کیا جائے۔ اس موقع پر رقص و سرود کا اہتمام بھی قابل اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ تشہیری مہم پر بے دریغ پیسہ خرچ کیا جائے۔ انتظامی عہدوں پر فائز تمام افران کو انفرادی طور پر دعوت دی جائے۔ فوری طور پر افتتاحی تقریب کے لیے قیمتی کارڈ چھپوا لیے جائیں۔ تقریب ایسی ہونی چاہیے، جو مدتوں یاد رہے۔ ہم کوئی معمولی خدمت پر مامور نہیں ہو رہے۔ افتتاحی تقریب کے لیے میرِ محفل کا انتخاب بھی سوچ سمجھ کر کیا جانا چاہیے۔ شخصیت مذہبی ہو یا غیر مذہبی، اس کا لباس مغربی ہو یا مشرقی، صحت سلامت ہو یا صاحب کرامت ہو، افتتاح کا حقدار ہو یا ڈیرہ دار ہو، خاتون ہو یا حضرت۔ کیونکہ خواتین کو بھی برابر کی نمائندگی دینا ضروری ہے۔ تیسری اہم بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ قومی بھلائی کے خواب اپنوں کے لیے دیکھے جائیں یا غیروں کے لیے۔ اپنوں کے لیے تو ہر کوئی خواب دیکھتا ہے، غیروں کی بھلائی کے لیے خواب دیکھنا عزت و وقار میں اضافے کا باعث بنے گا۔ مگر بزرگوں کی دانش کا کیا کیا جائے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ اپنے پھر بھی اپنے ہوتے ہیں اور غیر بہر حال غیر ہوتے ہیں۔ ناچار اپنا ارادہ اور خوابوں کی سمت تبدیل کرنا پڑی۔

خدا خدا کر کے جب یہ مراحل طے ہو گئے تو ایک اور بلا نے آن گھیرا۔ یہ سوال کُلبُلانے لگا کہ خواب دیکھنے کی ابتدا کسی عظیم شخصیت کی پیدائش سے کی جائے یا وفات کا دن مناسب ہو گا؟ مگر مشکل یہ ہے کہ اکثر عظیم شخصیات کی پیدائش کے دن میں گڑبڑ ہوتی ہے اور جن کی وفات میں گڑبڑ نہ ہو ان کی موت متنازع ہوتی ہے۔ پھر خیال آیا کسی عظیم تاریخی واقعے سے خواب دیکھنے شروع کیے جائیں۔ اس خوش کن خیال پر اس وقت اوس پڑ گئی۔ جب یہ سوال ذہن میں اُبھرا کہ غیر مذہبی اور مغربی ذہنوں کو متاثر کیے بغیر کامیابی کے امکان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سوچا عیسوی مہینوں کے کسی دن سے ہی ابتدا کر دینی چاہیے۔ پھر ایک خطرہ یہ لاحق ہوا کہ کہیں مذہبی لوگ اس دن کو غیر اسلامی قرار دے کر ہمارے خوابوں کو ہی لادین خواب قرار نہ دلوا دیں۔ مذہبی لوگوں کی حد درجہ حساسیت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف سے روشن خیال دوستوں کی لاابالی طبیعت سے بھی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں وہ رائج شمسی نظام سے قمری نظام کی طرف میری مراجعت کو مذہبی شدت پسندی پر محمول نہ کریں۔ اسی کشمکش میں یہ خیال سوجھا کہ کیوں نہ کسی جوتشی یا ماہر علم جفر یا ماہر تعبیرات سے رابطہ کر لیا جائے تاکہ مناقشے اور محاسبے سے بچا جا سکے۔

جوتشی کے پاس جانے میں فائدہ نظر آیا تو بھلائی کے خوابوں کا رخ خود بخود جوتشی کی طرف مڑ گیا۔ مگر پھر یاد آیا کہ جوتشی تو بکرمی کیلنڈر لے کر حساب کتاب کرتے ہیں۔ وہ علم رمل کے ماہر ضرور ہوتے ہیں مگر جمعہ، ہفتہ اور اتوار کی فضیلت کے قائل ہی نہیں ہوتے۔ ڈر محسوس ہوا کہ کہیں جوتشی سے ساعتِ سعید پوچھتے پوچھتے عقیدت مندی کا جوہر ہی نہ گنوا بیٹھوں۔ جو میرے لیے بنائے فضیلت ہے۔ مگر ایک بات ہے کہ جوتشی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور اپنے پیشے سے بہت مخلص ہوتے ہیں۔ ہیرا پھیری کا امکان بھی ان کے ہاں کم ہی ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ میں رہے تو اچھا ہے۔ لہٰذا فیصلہ کیا کہ کسی پیر، فقیر سے پوچھ لینا ٹھیک رہے گا۔ مگر جعلی پیر بھی تو جگہ جگہ منڈلی جمائے بیٹھے ہیں۔ ہاں یاد آیا، اپنا پرانا دوست جو دیسی دنبوں کا کاروبار کرتا ہے اس کے پیروں، فقیروں سے بہت اچھے مراسم تھے۔ مگر نہیں، وہ تو خود دنبوں سے دنبالے تک رسائی کے طریقے ڈھونڈ کے فاصلے پر ہے۔ تو کیوں نہ فیس بک، گوگل اور (click) رہا تھا۔ ان سب کو چھوڑ دینا مناسب ہوگا۔ ہماری دنیا تو آج ایک کلک ڈیپ سیک سے مدد لے لی جائے۔ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے، گمنام مدد بھی مل جائے گی اور کسی کا شرمندۂ احسان بھی نہیں ہونا پڑے گا۔ ورنہ عام حالات میں کسی سے کچھ پوچھ لیا جائے تو ساری زندگی کے لیے آدمی طعنے سہتا اور سنتا رہتا ہے۔ لہٰذا محفوظ راستہ یہی ہے کہ سوشل میڈیا کی مدد سے نیک کام کا آغاز کیا جائے۔ سوشل میڈیا تک رسائی پائی تو خدا یاد آیا، ایک دنیا آباد ہے۔ خیالوں کی، خوابوں کی، مثالوں کی اور تمثالوں کی۔ پر اتنے خواب، اتنے خیال، اتنے سوال، اتنے جواب، اتنے عکس، اتنے نقش، اکیلا آدمی ان سب کو لے کر کیا کرے گا۔ گمراہی کے ہزار رستے، سچائی کا ایک اور وہ بھی تلاش کے بغیر گم دکھائی دے۔ ہر طرف سے چکاچوند سے آنکھیں خیرہ، عقل حیران، دل ویران۔ باوجود بسیار کوشش کے، کوئی مدد نہ پا کر مایوسی کو جھٹک کر اپنی طبیعت کو آزمایا تو مبالغے کو رہنما پایا۔ قومی بھلائی کے خواب دیکھنے والا معمولی آدمی نہیں ہوتا بلکہ انسان ہی نہیں ہوتا۔ پھر خیال آیا، نہیں، انسان تو خیر ہوتا ہے۔ ماورائے انسان کہنا ٹھیک رہے گا۔ لہٰذا بھلائی کے خواب دیکھنے سے پہلے، ہمیں خود کو سر بلند کرنے کی مہم سر کرنا تھی۔ خود کو سربلند کیے بغیر اگر خواب دیکھے جائیں تو اس میں مطعون خواہشیں شامل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً: بیٹے کی شادی میں بڑے لوگوں کو بلاؤں گا، کسی کو ناراض نہیں جانے دوں گا، جھومر ڈالنے والوں کو تو خوش کر دوں گا۔ اگر مجھے خود بھی ناچنا پڑا تو شرم محسوس نہیں کروں گا۔ اب ان خوابوں سے کوئی بھلائی کے خواب تلاش کرے تو کیسے؟ یا پھر یوں کہ جب میری دوسری شادی ہوگی تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگوں گا کہ اے اللہ! مجھے اولادِ نرینہ عطا کر۔ بچے کا نام پر دادا کے نام پر رکھوں گا۔ بیٹا جب کچھ بڑا ہوگا تو اس کو سکول میں داخلہ کرا دوں گا۔ بستہ اُٹھا کر سکول جائے گا تو میرا بیٹا کتنا اچھا لگ رہا ہوگا۔ بھائی سچ یہی ہے۔ اہلِ مشرق اولادِ نرینہ سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ جو معمولی خوابوں کے سوداگر ہیں وہ غیر معمولی خوابوں کے خریدار نہیں بن سکتے۔

قومی بھلائی کے خواب دیکھنے کی منزل کو قریب تر پائی تو مجھے اپنا قد کاٹھ معمول سے زیادہ بڑا نظر آیا۔ یقین ہو گیا کہ قدرت نے مجھے خواب سازی کے لیے چن لیا ہے۔ اب مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ خواب گر کی حیثیت سے مجھے عوام الناس کی موجودگی میں سرو قد کھڑے ہو کر خواب دیکھنا ہوں گے یا آلتی پالتی مار کر چبوترے پر حالتِ استغراق میں بیٹھنا ہوگا۔ تاکہ لوگوں کو صاف دکھائی دے کہ کوئی خواب گر بھلائی کے عظیم خواب دیکھنے میں مصروفِ عمل ہے۔ پھر خود ہی فیصلہ کیا کہ اگر تنہائی میسر ہوئی تو خوابوں کے لیے آرام دہ بستر سے بہتر کوئی جگہ نہیں اور اگر ہجومِ دوستاں ہوا تو مسند نشینی ٹھیک رہے گی۔

اسی اثنا میں کیا دیکھتا ہوں کہ تختِ تعظیم پر مسند نشیں ہوں۔ دنیا جہان کی ہر شے میرے احاطۂ قدرت میں آ گئی ہے۔ مگر یہ کیا، اتنی تعداد میں ننگ دھڑنگ لوگ؛ خدائے عظیم کی وسیع کائنات میں، یہ تو پاپ ہے۔ ان سب کے تپش رسیدہ بدن میرے خوابوں میں خلل ڈال دیں گے۔ ان کے لیے تو ریشم و کم خواب کا لباس ہونا چاہیے۔ اُف خدایا! پہلے ہی خواب نے مشکل میں ڈال دیا۔ یہاں تو خواب اور فساد ایک ہو گئے ہیں۔ خواب تو صرف دیکھے جاتے ہیں اور خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔

شور اور شعور

مخالفت برائے مخالفت کی بات اور ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب تک شور ہماری سماعتوں سے نہ ٹکرائے، اس وقت تک شعور کے دروازے نہیں کھلتے۔ عجب ہے کہ انسان شور سے ڈرتا ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ انسان جتنا شور سے ڈرتا ہے اس سے کہیں زیادہ شعور سے ڈرتا ہے۔ جتنا شعور سے ڈرتا ہے اس سے کہیں زیادہ شاعری سے خوف کھاتا ہے اور جتنا شاعری سے خوف کھاتا ہے اس سے کہیں زیادہ جدید شاعری سے دور بھاگتا ہے۔ شعور سے تو خیر دنیا کی بڑی طاقتیں بھی خوف کھاتی ہیں اور بڑے بڑے سورما اور جنگجو شعور کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً جب شعور، اجتماعی شعور کی شکل اختیار کر لے، تو ہر ناسور کا راستہ بند کر دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بچے فطرت خدا پر پیدا ہوتے ہیں اور جو فطرت خدا پر پیدا ہوتے ہیں وہ شور سے شعور کی طرف لپکتے ہیں۔ اور جو فطرت غذا سے پلتے ہیں وہ شور سے شر کی طرف بڑھتے ہیں۔ البتہ ہر ملک اور خطے کی روایات اور اقدار مختلف ہوتی ہیں۔ اس لیے کہیں تو بچے صرف شور کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں اور کہیں شعور کے لیے۔ زیادہ سے زیادہ اس میں فتنہ و فتور کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ شور اور شعور میں اتنا فرق ضرور ہے کہ شور بلند ہوتا ہے اور شعور بیدار ہوتا ہے۔ دوسرا انسان کی عادت ہے کہ ہر بات اور ہر دعوے کے لیے دلیل چاہتا ہے۔ تو سنیے: اس مادی اور فانی دنیا میں جتنے بھی بزعمِ خود طاقتور کہلوانے والے انسان دکھائی دیتے ہیں، وہ سب سے زیادہ شور اور شعور سے خوف کھاتے ہیں۔ معمولی سے معمولی شور ان کی نیندیں حرام کر دیتا ہے۔ شور تو درکنار ذرا سی آہٹ ان کے اعصاب معطل کر دیتی ہے۔ شور کہیں سے آ رہا ہو، شور کوئی مچا رہا ہو؛ اُن کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پوری حکومتی مشینری ہائی الرٹ ہو جاتی ہے۔ ہرکارے مشرق و مغرب کی طرف دوڑا دیے جاتے ہیں۔ خفیہ نظام حرکت میں آ جاتا ہے۔ حکمران رہائش گاہ سمیت اپنے زیرِ استعمال ہر شے کو بدل ڈالتے ہیں۔ انہیں طرح طرح کے گمان گھیر لیتے ہیں۔ خیالات خوفناک منظر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ مناظر کبھی ہجوم بن کر شاہ کو ڈراتے ہیں اور کبھی شاہ پرستوں کو ناکوں چنے چبواتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ شور اور شعور کسی سے نہیں ٹکراتے، نہ حق سے نہ حقائق سے، نہ زمیں سے نہ زمیں زادوں سے۔ شور اور شعور سے صرف چور اور غاصب کو خطرہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شور تو کسی بچے کا بھی کم اہم نہیں ہوتا۔ چہ جائے کہ بڑے بوڑھے شور کرنے لگے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ بہرا پن اتنا خطرناک نہیں ہوتا، جتنا بہرا بن جانا خطرناک ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ بچے کا شور، ماں کو سنائی نہ دے اور عوام کا شور حکمران کو سنائی نہ دے۔ جوانوں کا شعور سماج کو دکھائی نہ دے یا پھر گھر کا شور باہر سنائی دینے لگے۔

اگر شور عجیب شے ہے تو انسان اس سے بھی عجیب تر شے ہے۔ جس نے اپنے ہر نفع و نقصان کو شور کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ جوڑ رکھا ہے۔ شور بلند ہوتا ہے تو انسان کی طبیعت میں بھی اُبال آ جاتا ہے۔ پھر شور کم ہوتا ہے تو ہو جائے، انسان کا جوش کم ہونے میں نہیں آتا۔ کیا خبر انسان نے شورِ ظہور کے دن سے ہی ہر شور کے ساتھ اپنے مقصد اور مقدر کا سودا کر رکھا ہو۔ کیونکہ طبیعت کا اُبالی پن اسے نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ اس لیے سودے پہ سودے کرتا ہے، مقاصد بدلتا ہے، مطالب بدلتا ہے، معیارات بدلتا ہے، خیالات بدلتا ہے، سب کچھ بدل لیتا ہے مگر سودے بازی سے باز نہیں آتا۔

انسان نے ہمیشہ اپنے لاابالی پن اور جذباتی طبیعت کے ہاتھوں نقصان اٹھایا اور دھوکہ کھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جب اپنے کیے پر پچھتاتا ہے تو پہلے سے کیے ہوئے ہر فیصلے کو خود ہی مسترد کر دیتا ہے۔ جیسا کہ شور کے حوالے سے انسان نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ شور بے ہنگم اور بلند آہنگ آوازوں کے یک جا ہونے کا نام ہے اور یہی آوازیں اور شور ہی تو ہیں، جو انسان کا سکون غارت کیے ہوئے ہیں۔ مگر جب تنہائی ڈسنے لگے اور شور کے لیے کان ترس جائیں تو تنہائی اور خاموشی سے نجات کے لیے آواز سے بہتر کوئی شے نہیں۔ انسان نے پہلے پہلے میں شور کے خلاف محاذ تو بنایا تھا مگر شور کے بغیر زندگی کا ہر رنگ پھیکا، اور بے معنی لگا۔ تب شور نے شعور بن کر در سماعت پر دستک دی تو خود سے کہنے لگا، سچ ہے کہ اگر ملازم شور نہ کرے تو تنخواہ نہیں ملتی، عاشق شور نہ کرے تو وفا نہیں ملتی، بچہ شور نہ کرے تو غذا نہیں ملتی، کمزور شور نہ کریں تو پناہ نہیں ملتی، شاعر، شور نہ کرے تو واہ واہ نہیں ملتی، بیمار شور نہ کرے تو دوا نہیں ملتی، مظلوم شور برپا نہ کرے تو ظالم کو سزا نہیں ملتی۔ پھر تو اسے کارخانۂ قدرت کی ہر شے میں شور کارفرما نظر آیا۔ شور و شغب کے بغیر دنیا اسے معنی و مناجات سے خالی نظر آنے لگی۔

کبھی غور کیا کہ انسان مخلوقات، موجودات اور محسوسات کے حوالے سے اپنی پسند و ناپسند کو بار بار کیوں بدلتا ہے؟ ایک وقت ایسا بھی آیا جب انسان نے اناج دار فصلوں کے علاوہ ہر طرح کی نباتات کی بیخ کنی کا فیصلہ کر لیا، آؤ دیکھا نہ تاؤ جڑی بوٹیوں کی تلفی پر تُل گیا۔ کچھ اور ہاتھ نہ لگا تو حشرات الارض کو دشمن قرار دے کر کیڑے مکوڑے، پروانے، پتنگے؛ بے حساب مار ڈالے۔ ان میں سے تو کسی نے شور شرابا نہیں کیا تھا۔ اُن سے جی نہ بھرا تو سانپ، بچھو، بندر، بھالو، بھیڑیا پر نظر جا پڑی تو ان کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ پنکھ پکھیرو بھی اس کی زد میں آ گئے۔ پھر خلا کو ملا اور ملا کو خلا بنانے لگا اور جب کچھ نہ بن پڑا تو شور کو شوریدگی سے ملانے لگا۔ ایک وقت میں چپ بیٹھنے والے کو رگیدتا ہے تو دوسرے لمحے بولنے والے کو خاموش کراتا ہے۔ دور سے آواز آئے تو اچھی، قریب سے آئے تو بُری۔ پھر پہلو بدل کر فیصلہ ہی بدل دیتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ کائنات کی نبضیں اسی کے کنٹرول میں ہیں۔ ہرگز نہیں۔ جب تک فیصلے کا اختیار شورِ نشور سے جُڑے ہوئے شعور کے ہاتھ میں نہ ہوگا، اُس وقت تک دماغ کا فتور انسان کو کبھی مستقیم نہ رہنے دے گا۔ اسی لیے جسے دیکھو، شور کا شاکی نظر آتا ہے۔ ہم دوسروں کو خاموش ہونے کی تلقین کرتے ہیں مگر خود خاموش ہونے کا نام نہیں لیتے۔ اگر ہم سے سوال کیا جائے کہ آپ شور کو پسند کرتے ہیں یا خاموشی کو؛ تو ہم میں سے اکثر کا جواب تو خاموشی کے حق میں ہوگا۔ مگر عمل مخالف سمت میں ہوگا۔ یہاں تک کہ حالتِ خواب میں بھی انسان خاموش نہیں رہ پاتا۔ البتہ ہمیں دوسروں کا شور اور آوازیں کسی طور اچھی نہیں لگتیں۔ چاہے وہ آواز، کسی نقطۂ نظر کی صورت میں ہو یا نظریۂ زندگی ہو؛ نعرۂ مستانہ ہو یا آہ و بکا ہو؛ ایسی آوازیں ہماری سماعتوں کے لیے ناپسندیدہ شور ہی رہتی ہیں۔ مگر ہماری اپنی آوازیں، ہمارے بچوں کی دھما چوکڑی، ہمارے سکول کا شور، ہمارے گھر کی موسیقی؛ یہ کبھی بلا مقصد نہیں ہوتیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ انسان ہر شور کا مخالف نہیں۔ جو شور انسان کے فائدے کی نوید لے کر آئے، اس سے ہمارا شعور جلد ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ ابنِ آدم کبھی شورِ ظہور کا مخالف نہیں رہا، یہ وہی شور تو ہے جس شور نے کائنات کی بسیط خاموشی کو توڑا تھا۔ انسان آج بھی اس شور کا شکر گزار ہے جس نے ہمارے شعور کو جلا بخشی۔ جس نے عقل کے پردوں پر پہلی مرتبہ دستک دی۔ جس نے تنہائی کے خوف سے انسان کو نجات دلائی۔ جس نے موسیقی کی دھنوں کو جاری و ساری کیا۔ جس سے کُن کی کرن پھوٹی۔ مگر شورِ نشور، جس کے بارے میں ہم نے سن رکھا ہے کہ وہ شور، قیامت برپا کر دے گا۔ ایسے شور کا سن کر ہماری روح فنا ہوتی

ہے۔ اسی لیے شور قیامت سے تو ہم ابھی سے خوفزدہ ہیں۔ اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہمارے خوف میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ شورِ نشور سے منسلک ہر حقیقت کو چھپاتے پھرتے ہیں۔

شور اگر خارج میں ہو تو ہمیں واقعات و سانحات و حادثات کی خبر دیتا ہے اور یہی شور اگر ہماری ذات میں داخل ہو جائے تو شعور میں ڈھل جاتا ہے۔ وہی شور جو شعور میں ڈھل گیا تھا ہماری ذات میں متلاطم رہتا ہے۔ یہی متلاطم موجیں اظہار کے راستے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اسی من کی موج کا نام فن ہے۔ جو مختلف صورتوں اور شکلوں میں نمودار ہوتا ہے۔ جسے ہم کبھی شاعری کا نام دیتے ہیں؛ کبھی مصوری کا اور کبھی آرٹ کے نام سے جانتے ہیں۔ اسی لیے تو شور کو شعور کی سیڑھی کہا گیا ہے۔ یاد رہے، انسان کا بلندی کی طرف سفر؛ شور اور شعور کی یکجائی سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ شاعری کی پیدائش بہت بعد کی بات ہے۔

سننے میں آیا ہے کہ شاعری کے لیے ایک طرح کی تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ جو نہ کل مفقود تھی اور نہ آج محدود ہے۔ البتہ اکیسویں صدی تک آتے آتے شعور اور شرارت، خواب و خیال ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال ہر دور میں شاعروں کو تنہائی اور عام لوگوں کو ہنگامہ آرائی عزیز رہی ہے۔ جانور البتہ تنہائی اور ہنگامہ آرائی دونوں سے دور رہتے ہیں۔ کچھ لوگ تو یہاں تک بھی کہہ دیتے ہیں کہ شاعر اور ادیب جس طرح کی خاموشی اور تنہائی کا تقاضا کرتے ہیں؛ وہ قبر، قبرستان اور خود شاعر کی ذات کے علاوہ کہیں میسر نہیں آ سکتی۔ شاید ایسا ہی ہو۔ چنانچہ دنیا میں بہت سے ادیب اور شاعر ایسے بھی گزرے ہیں جن کی پوری زندگی اسی تگ و دو میں گزری کہ کہیں شور اور شعور بلا اجازت گھر میں داخل نہ ہو جائیں۔ کیونکہ شور اور شعور کا وفور جنوں و مستی کے لیے زہر ہلاہل ہیں۔ شعر کے لیے ایسی تنہائی اور معاشرے سے ایسی پسپائی، صرف شعرا کے مزاج اور منصب سے لگا کھاتی ہے۔ یوں تو شاعری اور شور دونوں کا میدان اور محاسبہ الگ الگ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہاں یکجا کرنے کے کچھ فوائد دکھائی دیتے ہیں۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ جہاں کہیں ہمیں فائدہ دکھائی دے، ہم وہاں سے ٹلتے نہیں۔ کیونکہ ہم نفع و نقصان کے ترازو میں تولے بغیر کسی چیز کا نہ تو ذکر کرتے ہیں، نہ کسی کا ذکر سنتے ہیں۔ نہ قلم اٹھاتے ہیں اور نہ لب کھولتے ہیں۔

بات سیدھی اور صاف ہے کہ شاعری کے زور پر پوری نسل انسانی کو ڈرایا، دھمکایا اور خاموش نہیں کرایا جا سکتا۔ صرف ورغلایا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف شاعری سے ہی ورغلانے کا کام لیا جاتا ہے دیگر وسیلے بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ جدید شاعری کا قصہ اور قضیہ البتہ مختلف ہے۔ جس کے ذریعے شعور کا چراغ نہ جلایا جاتا ہے اور نہ بجھایا جاتا ہے۔ اس قضیے میں شعرا کو ابھی مکمل کامیابی نہیں ہوئی۔ صرف جزوی کامیابی کا امکان ہے، اور وہ بھی اس حد تک کہ جونہی شعرائے جدید نثری شاعری کی کتابِ معنزناک کا وَرَق الٹتے ہیں؛ لوگ باگ، بچوں کو، بڑے بوڑھوں کو، اہل خانہ اور مریضوں کو سرِ شام اپنے حصار اور حفاظت میں لے لیتے ہیں۔ تاوقتیکہ نثری شاعری کے حملے کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ خبر ہے کہ نثری شاعری کا معمولی حملہ بھی بچوں اور بوڑھوں کے لیے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ کسی بھی معمولی چیز کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ عموماً معمولی واقعات و حادثات ہی تو دنیا میں غیر معمولی واقعات و حادثات کو جنم دیتے ہیں۔ مثلاً آدم کا عورت کو اور عورت کا مرد کو جنم دینا۔ پھر دونوں کا مل کر شر پسندی کو جنم دینا اور شر پسندی کا فتنوں کو جنم دینا۔ معمولی واقعے کا شاخسانہ ہی تو ہے۔ تبھی محتاط لوگ جدید شاعر اور کلاسیکل گلوکار سے فاصلے پر رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔

ویسے شعر اَ کی طبیعت انتقامی نہیں ہوتی۔ مگر جب شاعری کا دیوتا مہربان ہو کر طبیعت میں جولانی اور موضوعات میں وسعت بیانی عطا کرتا ہے۔ تو شاعر کا جلال، شورِ بے مثال میں ڈھل جاتا ہے۔ جو شعور کی ہر سرحد کو عبور کرتا ہوا شورِ سلاسل سے ہوتا ہوا شوریدگی کو لتاڑتا ہوا، شورِ پُشتی پر آدم لیتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ شاعری کی دیوی سب پر مہربان نہیں ہوتی۔ اور آسانی یہ ہے کہ شور کا دیوتا ہر ایک کے ساتھ خدمت گزار کے طور پر ہمہ وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ خدا کا شکر ہر حال میں بندے کو ادا کرتے رہنا چاہیے۔ اگر خدانخواستہ شاعری کی دیوی، شور کے دیوتا کی طرح سب پر مہربان ہوتی اور ہر مرد و زن، صغیر و کبیر؛ شعر کہنے پر قادر ہوتا، تو قیاس کریں ہماری زمین اور زمین زادوں کا کیا حال ہوتا؟

چنانچہ شاعری کے بغیر لاکھوں اور کروڑوں انسان آج بھی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر اس کے برعکس شور فطرت کی وہ للکار ہے۔ جس کے بغیر زندگی کا تصور ہی محال ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو ٹھیک ہوگا کہ زندگی شاعری کے بغیر آسودگی سے گزاری جا سکتی ہے، کوئی شاعری کا روگ پال لے تو اور بات ہے۔ تب وہ زندگی کے بجائے شاعری کو پالتا رہتا ہے۔ انسان، دنیائے دَنی میں جب پہلا سانس لیتا ہے تو پہلے پہل اس کی حسِ سماعت کے قُفل کو جو چیز توڑتی ہے، وہ شور کی ضرب شدید ہوتی ہے۔ تبھی نو مُولود پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ کسی اور دنیا میں آن پہنچا ہے۔ کہنا چاہیے کہ نومولود کو زندگی کا شعور، شور ہی عطا کرتا ہے۔ زندگی کے ہنگاموں سے وہ اسی لمحے آشنا ہوتا ہے جب ارد گرد کی ہنگامہ پرور دنیا کے شور سے ہڑبڑا کر یا تنگ آ کر آنکھیں کھول دیتا ہے۔ تو اس کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ کبھی نیند کی صورت میں اور کبھی ابدی نیند کے سبب سے ؛ مگر کان کھلے رہتے ہیں۔ تاکہ شور سنائی دیتا رہے۔ اسی لیے تو شورِ قیامت سن کر ہر انسان میدانِ حشر کی طرف بھاگے گا۔ شور اور شعور ہی تو انسان کو روزِ قیامت میدانِ حشر کی طرف لے جائیں گے۔ قیاس کریں کہ کسی نومولود کا قُفلِ سماعت، شور کی ضربِ شدید سے نہ ٹوٹے یعنی نووارد ظاہر کی آنکھیں ہی نہ کھولے تو اہل خانہ پر کیا گزرے گی اور اگر کوئی ظاہر کی آنکھیں نہ کھولے گا تو کائنات کا مشاہدہ کیوں کرے گا اور اگر کائنات کا مشاہدہ و مطالعہ نہ کیا، تو باطن کی آنکھ کیوں کر وا ہو گی اور اگر باطن کی آنکھ وا نہ ہوئی تو دل میں فن کا پودا کیسے پروان چڑھے گا اور فن کا پودا اگر جڑ نہ پکڑ سکا تو پھر تخلیق کے سوتے کیسے پھوٹیں گے اور تخلیق کے سوتے نہ پھوٹیں گے تو شاعری کیوں کر جنم لے گی۔ یوں کسی بھی اعلیٰ فن کا امکان اگر کہیں ہے تو شور میں پنہاں ہے۔

شور کی نعمتوں سے انکار دلیلِ کم نظری ہے۔ اگر بچے شور و شرابا نہ کرتے پھرتے۔ بڑے بوڑھے ہر وقت بڑبڑاتے نہ رہتے، خواتین تبادلۂ خیالات پر ہمہ وقت آمادہ نہ رہتیں، سڑکوں پر دوڑتی گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ نہ ہوتی۔ بادلوں کی گرج اور چمک نہ ہوتی، مٹکوں کی گھم گھماہٹ نہ ہوتی، پائل کی جھنکار اور کوئل کی پکار نہ ہوتی، پرندوں چرندوں کی پھڑپھڑاہٹ نہ ہوتی، گھر شور سے خالی اور شہر، شور سے آشنا نہ ہوتے؛ تو اب تک دنیا بھر کے ادیب اور شاعر اس قدر ادب تخلیق کر چکے ہوتے کہ اس میں سے ادب تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ تصور کریں، کروڑوں افسانے بکھرے پڑے ہوتے، ان میں سے افسانہ تلاش کرنا کتنا مشکل ہوتا۔ کروڑوں اشعار کے انبار تلے دبی غزل کے اشعار تلاش کرتے کرتے پوری زندگی گزر جاتی۔ ناول کی تلاش میں صدیاں گزر جاتیں۔ اس قدر گیت لکھے جا چکے ہوتے کہ خود گیت نگار اُکتا جاتے۔ یہ تو شور اور شعور کی کرم فرمائی ہے کہ آج ہر چیز اعتدال پر ہے ورنہ ہر شے اب تک ہماری بے اعتدالیوں کی نذر ہو چکی ہوتی۔

تعزیت نامہ

کسی کی موت پر پسماندگان سے اظہار رنج وغم کرنا اور مرنے والے کے حق میں کلمات خیر کہنا تعزیت کہلاتا ہے۔ البتہ موت کے اسباب تلاش کرنے کی روایت زیادہ پرانی نہیں ورنہ اکثر مرحومین اور تعزیت کنندگان تعزیت کی برکات سے محروم رہتے۔

ماضی کا یہ سماجی اور تہذیبی عمل بس اتنے فرق کے ساتھ آج بھی جاری ہے کہ ماضی میں تعزیت کرنے والوں کو طویل انتظار کرنا پڑتا تھا، تب کہیں سے کسی شخص کے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی خبر سنائی دیتی تھی۔ آفات وبلیلات کی بات اور ہے ورنہ معمول میں مرنا کچھ آسان نہ تھا۔ بعض لوگ تو تعزیت کے انتظار میں ہی بوڑھے ہو جاتے تھے انہیں تعزیت کا مناسب موقع ہی نہ ملتا تھا۔ چنانچہ کسی فرد کی موت کا سنتے ہی اگر لوگ لپک لپک کر تعزیت کرنے پہنچ جاتے تھے تو کچھ اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ ایک اور فرق کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ماضی میں مرگ انفرادی ہوتی تھی مگر تعزیت اجتماعی ہوتی تھی، مرحوم کے پورے خاندان اور پورے قبیلے سے تعزیت کرنا ہوتی تھی۔ انسانوں کے ساتھ تعزیت میں زمین اور آسمان بھی شریک ہو جاتے تھے۔ بے گناہ کی موت پر تو سرخ آندھیاں چلنے لگتی تھیں۔ تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ جب تک کوئی اور بے گناہ قتل نہ ہو جاتا تعزیت کا سلسلہ جاری رہتا۔ جس طرح آج امریکہ اس وقت تک کسی غریب ملک کے نہتے شہریوں پر بم برساتا رہتا ہے جب تک کوئی اور غریب ملک امن عالم اور خصوصاً "امریکہ کی سالمیت کے لیے خطرہ نہیں بن جاتا۔ آسمان وزمین تو شاید آج بھی انسان کی اجتماعی موت پر رنجیدہ ہوں اور تعزیت کے لیے تڑپ رہے ہوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ آسمان تعزیت کرے تو کس سے کہ سوگوار ہی نہیں ملتے، زمین روئے تو کس کس کے قتل پر روئے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انسانیت کے قاتل بھی ہم خود ہیں اور مقتول بھی۔ اس مرگِ اجتماعی پر آسمان نے شریکِ عزا ہونا چھوڑ دیا ہے اور سرخ آندھیاں بھی چلنا بند ہو گئی ہیں۔ اُلٹا آسمان سے عذاب اُترنے لگے ہیں اور زمین فساد اُگلنے لگی ہے۔ کثرتِ مرگ سے تعزیت گاہیں ہی ناپید ہو گئی ہیں۔ اور سوگوار ہیں کہ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ ہماری آنکھوں دیکھے مشاہدات اور کانوں سنے واقعات ہیں؛ جن کے سوگوار یا تو کہیں اَب دی نیند سو گئے ہیں یا ان کے لبوں پر سکوت کی مہریں لگی ہیں۔ مثلاً": ایک سٹیج شو میں ایک اعلیٰ خاندان کی دوشیزہ نے نیم عریاں لباس میں رقص کرتے ہوئے بڑی بڑی خاندانی رقاصاؤں اور عصمت فروش عورتوں کے پسینے چھڑا دیے۔ باپ خوشی سے نہال۔ سوگواروں کا کچھ اَتا پتا نہیں۔

بھائی، بہن اور باپ نے مل کر رقص کا ایسا مظاہرہ کیا کہ ناظرین کی نیتوں میں بھی فتور آنے لگا۔ آپ ہی تعزیت قبول کیجیے۔

مرد کی مرد سے اور عورت کی عورت سے شادی کا قانون پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ اس واقعے کی بھی تعزیت کرنے والا کوئی نہیں۔ آپ ہی سوگوار بننا قبول کریں۔

باپ کی وفات پر صاحبِ جائیداد بیٹوں میں کفن خریدنے پر تکرار، اسی بحث وتکرار میں بھائی نے بھائی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اب باپ، بیٹے کے جنازے کا اعلان بعد میں ہوگا۔ تعزیت قبول کیجئے۔

دس لاکھ کی آبادی نے پھر ایک اوباش کو اپنا نمائندہ چن لیا۔

ایک سرکس کا اداکار ایک بڑے ملک کا سربراہ بن گیا۔ جس نے حال ہی میں پروفیسروں اور دانشوروں کو علم کے فوائد پر مفصل لیکچر دیا۔

ایک جنسی خدمات انجام دینے والی نے پوری نسلِ انسانی سے خطاب کیا اور خاص طور پر اپنا پیغام نسلِ نو تک پہنچایا۔ وہ بار بار خدا کا شکر بھی ادا کرتی رہی کہ اللہ تعالی نے اسے عزت سے نوازا۔ ان واقعات و مشاہدات کے سنہ سوگوار ملتے ہیں سنہ پرسہ دینے والے نظر آتے ہیں۔

آج کا انسان اس حوالے سے بڑا خوش نصیب واقع ہوا ہے کہ اسے تعزیت کرنے کے جتنے مواقع سال بھر میں مل جاتے ہیں شاید ماضی میں دس نسلوں کو بھی تعزیت کے اتنے مواقع نہ ملے ہوں گے۔ اس کے باوجود ہمارے عہد کے لوگ تعزیت و تاسف کے معاملے میں لاپروائی اور کاہلی کا شکار ہیں۔ ماضی میں دسیوں سال گزر جاتے؛ فتنہ و فساد کا نام سننے کو کان ترس جاتے تھے۔ معمولی جھگڑے زبانی تکرار سے آگے نہ بڑھ پاتے۔ ظالم سے ظالم بادشاہ ہیرے جواہرات لوٹنے اور تاوان جنگ پر ہی اکتفا کر لیتے اور اسی کو ہی حاصل جنگ سمجھتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ کسی دوشیزہ کو شہزادی بنا کر ساتھ لے جاتے۔ یہ تو بھلا ہو؛ چنگیز خان اور ہلاکو خان کا؛ اگر نہ ہوتے، تو سوگواریت کی مثال دینا بھی مشکل ہو جاتا۔

آج تعزیت کرنے والوں کو بہت سہولتیں حاصل ہیں۔ آپ خود سوگوار ہونا چاہیں یا آپ کا کوئی عزیز رشتہ دار سوگوار ہونا چاہے تو کچھ رکاوٹ نہیں۔ جس طرح آپ کی ایک فون کال پر آج دنیا کی ہر سہولت میسر ہے۔ اسی طرح فرشِ مرگ کو سجانے والے اور اُونچے سروں میں رونے رلانے والے کرائے پر دستیاب ہیں۔ یہاں تک کہ مذہبی اجتماعات کا انعقاد تو ان رودھالیوں (کرائے پر رونے والے) کے بغیر اب ممکن ہی نہیں رہا۔ لاکھوں روپے خرچ کر کے رودھالی مردوں اور عورتوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ماضی میں مُردے کو یہ سہولتیں کب حاصل تھیں۔ عصرِ حاضر کے ہر آدمی کو شکر کرنا چاہیے کہ وہ زمانۂ ماضی میں موت سے ہمکنار نہیں ہوا اور نہ اسے بھی اپنے دیگر عزیزوں کی طرح خاموشی سے دفن ہونا پڑتا۔ نہ رونے رُلانے والے بلائے جاتے، نہ ہی کوئی اور اہتمام ہوتا۔ بس میت اُٹھا کر قبرستان لے جاتے اور دفن کر دیتے۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ کون دنیا میں آیا تھا اور کون گیا۔ مگر اب تعزیت کے وہ پرانے آزمودہ طریقے یک قلم ترک کر دیے گئے ہیں۔ یوں بھی عہدِ حاضر سپیشلائزیشن یعنی خاص مہارتوں کا زمانہ ہے۔ چنانچہ ماضی میں بیویاں بھی عموماً سوگوار طبیعت کی اور نان پریکٹسنگ لائی جاتی تھیں۔ اب، جب تک بیوی ماہرِ فن نہ ہو، یعنی رونے رلانے کے فن سے خوب واقف نہ ہو، اسے بیاہ کر کوئی نہیں لاتا۔ اسی لیے اِن دنوں تعزیت کو تضیعِ اوقات، فرسودہ اور غیر مہذب عمل قرار دینے والے کچھ شرمندہ شرمندہ پھرتے ہیں۔ کیونکہ تعزیت کے مخالفین کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ تعزیت کا کاروبار اتنا چمک اُٹھے گا۔ علاوہ ازیں تعزیت وقت گزارنے کا بہترین مشغلہ بھی تو ہے۔ اگر آج بھی کوئی مسلسل تعزیت کا ہنر و حوصلہ رکھتا ہے؛ تو جان لیجیے وہ اپنی ماتمی لَے میں حکومتی ارکان، مل مالکان، سرکاری افسران اور میڈیا کے منہ پھٹ نمائندگان کو بُرا بھلا بھی کہہ دے تو کوئی بُرا نہیں مانے گا۔ کتنے ہی سیاستدان ہیں جنہیں تعزیت کی سمجھ بوجھ نہ تھی۔ ان کا سارا سرمایہ ڈوب گیا۔

چنانچہ مان لینا چاہیے کہ تعزیت کو انسانی فکر میں بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ تعزیت کے موقع پر ہر چھوٹے بڑے کو تعزیتی کلمات کہنے کی پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔

ایک صاحب کا کہنا ہے، خدا کے بعد میرا اس فلسفے پر مکمل ایمان ہے کہ مرنے والا ضرور مرتا ہے اور نہ مرنے والا بار بار مرتا ہے۔ دوسرے صاحب نے کہا، تعزیت کے لیے جانے والے کو کچھ دیر کے لیے ہی سہی مایوسی اور موروثی بیوی سے نجات مل جاتی ہے۔ یہی وہ خوشگوار لمحے ہوتے ہیں جب آپ کے جھوٹ کو سچ سے بھی زیادہ اہمیت ملتی ہے۔ ایک اور صاحب نے رائے دی، تعزیت وہ سماجی عمل ہے جو قاتل تک کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے، مگر قاتل کا باطنی خوف اسے شریک تعزیت نہیں ہونے دیتا۔ کیونکہ اسے تو تعزیت کے پورے عمل سے ہی نفرت ہوتی ہے۔ وہ تو مقتول کے ہر نشان کو مٹانے یا چھپانے میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ارد گرد کی ہر شے کو مقتول کا وارث سمجھ کر اس سے خوف کھانے لگتا ہے۔ اسے وہ لمحے، وہ موسم، اس موسم کی نباتات، فصلیں اور چرند پرند سب مقتول کے ہم نواد کھائی دینے لگتے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایک اور صاحب کہنے لگے، تعزیاتی اُمور اور بیگماتی شعور میں دخل دینا حماقت جبلی اور خجالت خفی کے سوا کچھ نہیں۔ ہم نے سند مانگی، تو ہمایوں بادشاہ اور جہانگیر کی مثالوں سے ڈرانے لگے۔ واقعی دونوں کی زندگیاں توبہ اور طوفان کے در وا کرتی ہیں۔

سچا رب گواہ ہے ہمیں تعزیت، شیطان کبیر اور علمی کتابوں سے چڑ نہیں۔ بس آداب تعزیت سے ناواقفیت نے محتاط بنا دیا ہے۔ مگر کیا کیا جائے، تعزیت سے مکمل طور پر منہ موڑنا بھی تو کچھ ٹھیک نہیں۔ چنانچہ ہم نے بھی سوگوار خاندان سے اظہار تعزیت کی ٹھانی اور پرانی گاڑی پر سوار سوگواروں سے تعزیت کا پروگرام بنایا۔ پھر خیال آیا، پرانی گاڑی بچوں کے سکول چھوڑنے کے لیے مختص ہے۔ دوسرا یہ کہ، لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں گاڑی اچھی اور قیمتی ہونی چاہیے۔ پھر خیال آیا یہ نہیں، نئے ماڈل کی گاڑی ٹھیک رہے گی۔ سوچا، اپنے ایلیسیشن کو بھی ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔ یہ بیچارا بھی کچھ آؤٹنگ کر لے گا۔ پھر سوچا، کہیں تعزیت گاہ کے کتوں سے ہمارے کتے کی مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ خدا خدا کر کے گاڑی میں بیٹھے تو مرحوم کا خیال ستانے لگا کیا؛ بھلا مانس تھا، مرتا مر گیا، مگر جائیداد پر حرف نہ آنے دیا۔ مرحوم، مرحوم کی نوجوان بیوہ، نوجوان بیوہ کے علاوہ اچھی خاصی جائیداد؛ جیسے خیالوں سے دماغ میں پھونچال اور تعزیتی موڈ میں خلل آنے لگا۔ پھر بھی طبیعت پر جبر کرتے ہوئے ہم جیسے تیسے سوگوار خاندان سے تعزیت کے لیے پہنچے تو دیکھا کہ ہر چہرہ سوگوار ہے، دل باغ باغ ہوں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک صاحب نے روایتی تعزیتی کلمات یوں ادا کیے، مرحوم کا یوں بے وقت رخصت ہونا بہت دکھ کی بات ہے ہماری تو ان سے ایک ہی ملاقات تھی ہم نے خلوت۔ بس اتنا کہہ پائے تھے کہ سوگواران میں سے ایک نوجوان جو شاید مرحومہ کا قریبی عزیز تھا، کے پہلے تیور بدلے، پھر لہجہ زہرناک ہوا، زبان سنبھال کے، اب اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو گُدّی سے زبان کھینچ لوں گا۔ خبیث، جہنمی۔ پھر تو کچھ ہاتھ تعزیت کنندہ نوجوان کے گریبان تک بھی آ پہنچے۔ نازیبا کلمات سے اسے نوازا گیا۔ تعزیت کنندہ نے جو حالات کو بدلتے دیکھا، تو بادلِ نخواستہ وہاں سے بھاگنے کی ٹھانی۔ مگر ہجومِ سوگواراں نے اسے موقع نہیں دیا۔ کافی دیر تک تعزیت کنندہ نوجوان ہجوم کے کندھوں اور سروں پر سوار رہا۔ تعزیت کنندہ نوجوان کبھی سجدۂ شکر میں دکھائی دیتا، تو کبھی سروں پر معراج کرتا نظر آتا۔ ترقی اور تنزلی کا یہ عمل دیر تک جاری رہا۔ مگر ان ناسازگار حالات میں بھی نوجوان کا حوصلہ نہیں ٹوٹا۔ جب تک ہوش و حواس میں رہا اور سروں پر معلق رہا، ہاتھ کے اشاروں سے زندگی اور زندہ دلی کا ثبوت دیتا رہا۔ آخر کار کچھ متحمل مزاج

افراد کی مداخلت سے رہائی ملی۔ کسی نے کہا، ان صاحب سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے؛ جب بھی ہمارے ہاں جمہوریت اور جانبداری فروغ پاتے ہیں، تو یہ ایسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اس واقعے کے بعد ہم تعزیتی اُمور کے معاملے میں اور زیادہ محتاط ہو گئے۔

معلوم نہیں ہمارے بزرگوں کو تعزیت کے اصول وضع کرنے کا خیال کیوں نہ آیا۔ جب کہ زمانے نے ہر شے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ بغیر اُصول وضوابط کے تو اب بندر بھی لقمہ نہیں توڑتا۔ لہٰذا ہر کام قاعدے اور قانون سے ہونا چاہیے۔ کسی کی موت پر یوں ہی جاہلوں کی طرح منہ اُٹھا کر چلے جانا، اور صرف روایتی تعزیتی جملے ادا کر کے گھروں کو چلے جانا بے رحمی بلکہ بد تہذیبی اور جہالت کی علامت سمجھا جا رہا ہے۔ ضروری ہے کہ نہ صرف تعزیتی اجلاس بلائے جائیں بلکہ تعزیتی جلوس بھی نکالے جائیں۔ دو چار منٹ کی علامتی خاموشی تو مردے سے سنگین مذاق کے علاوہ کچھ نہیں۔ ماضی میں مُردوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا تھا، میت کی روح کو تسکین پہنچانے کا کوئی اہتمام ہی نہ ہوتا تھا۔ ورثا خاموشی سے مُردے کو دفن کر کے گھروں کی راہ لیتے تھے۔ مگر اج شعور نے ترقی کر لی ہے۔ آج تو گیا گزرا خاندان بھی اپنے مردے کے ساتھ ایسے سلوک کا روادار نہیں۔ آج ہر ممکن طریقے سے کوشش کی جاتی ہے کہ میت کو باقاعدہ شہر کے مختلف دروازوں کا درشن کرایا جائے۔ ممکن ہے مُردے کو کوئی بھولی بسری بات ہی یاد آجائے۔ اس گہما گہمی میں دو چار مزید جنازے تیار ہو جائیں، تو کیا حرج ہے۔ میت کی روح کو بھی تسکین ہو گی کہ تنہا نہیں جا رہے، لاؤ لشکر ساتھ ہے۔ ہم نے مردِ ناداں اور آفتِ ناگہاں کے ناخوشگوار تجربے کے بعد سیکھ لیا ہے کہ اب تعزیتی اُمور میں مزید احتیاط برتنا ہو گی۔

لیجیے، ہمارے محلے میں مولوی نقب الدین کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی عمر پچاسی سال اور پسماندگان کی تعداد کچھ اس سے زیادہ ہو گی۔ مرحوم نے اولادِ نرینہ کے علاوہ پسماندگان میں بیوائیں، آشنا اور ناآشنا چھوڑے ہیں۔ انتقال کسی کا ہو، ہمیں صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ حسبِ روایت ہمیں مولوی نقب الدین کے انتقال پر بھی ملال ہوا۔ مرحوم زندہ دل، باحوصلہ اور اپنے کیے پر پشیمان ہونے والے نہ تھے۔ ہمیشہ طبقۂ نسواں اور سچ کے خلاف آواز بلند کی۔ مگر عزیزوں اور دوستوں نے ساتھ نہ دیا۔ نتیجتاً وہ ہر سچی بات کے خلاف ہو گئے۔ آخر آخر میں تو ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ کوئی اگر غلطی سے بھی کہہ دیتا کہ آج موسم خوشگوار ہے، آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں، سخت دھوپ اور گرمی سے نجات ملے گی، تو سیخ پا ہو جاتے۔ بادل کا برسنا، اور سورج کا بادلوں کی اوٹ میں چھپ جانا؛ یہ مناظر انہیں ایک آنکھ نہ بھاتے۔ سو انہی کی وفات پر ذہن میں ماتمی کلمات کو ترتیب دے رہا ہوں۔ بس میں نے تعزیتی امور کو موضوعِ بحث بنانے والی کتب کے مطالعے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ جاتے ہی مکین اور رونی صورت بنا کر سب کو سلام کروں گا۔ پھر یہ خیال ذہن سے جھٹک دیتا ہوں؛ کہیں مرحوم کے لواحقین اس کا غلط مطلب ہی نہ لے بیٹھیں۔ اول خیال کو خام خیال سمجھ کر رد کر دیتا ہوں۔ اچھا یوں کروں گا، خاموشی سے جا کر تعزیتی مجلس کے کونے میں گھس بیٹھوں گا۔ موقع ملتے ہی تعزیتی کلمات نہایت شائستگی سے اس طرح ادا کروں گا کہ خود مرحوم کے قریبی عزیز بھی ششدر جا رہ جائیں گے۔ مثلاً": مرحوم کو انسان تو خیر رو ہی رہے ہیں، در و دیوار بھی مرحوم کے بغیر سونے اور ویران لگ رہے ہیں۔ پھر سوچتا ہوں اگر رقتِ قلبی کے سبب سے گلا رندھ گیا اور جملہ ادا نہ ہوا تو کیا ہو گا۔ کم بخت کوئی دوست بھی تو ساتھ چلنے کو تیار نہیں اور میں جھوٹ بھی تو سلیقے سے نہیں بول سکتا۔ اسی اُدھیڑ بُن میں دوست کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ براہِ راست تعزیت کے لیے ساتھ لے جانے کا نہیں کہتا۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں بگڑ نہ جائیں۔ کہتا ہوں، سُنا، آپ نے وہی

لوگ جنہوں نے مولوی نقب الدین کے متعلق افواہ اڑائی تھی کہ مولوی ضد کا پکا اور عقیدے کا کچا ہے اور مرحوم کو فتنۂ امروز و فردا کے نفرت انگیز کلمات سے نوازا تھا، اب وہی لوگ مرحوم کے جنازے میں شرکت کے لیے جوق در جوق جا رہے ہیں۔ مولوی صاحب آپ کے تو قریبی عزیز تھے۔ ایسے میں ان کی آخری رسوم میں شرکت نہ کروگے۔ مرحوم کی بیواؤں سے دو بول تسلی کے نہ کہوگے۔ مگر انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اب مجھے تعزیتی اُمور نمٹانے کے لیے اکیلے ہی جانا تھا۔ سو میں نے سوچا یہ اُجلے کپڑے اچھے نہ لگیں گے، اگر میلے اور کچھ پھٹے پرانے کپڑے ہوں تو بہتر رہے گا۔ لہٰذا پھٹے پرانے کپڑے پہن کر مولوی نقب الدین کے سانحۂ ارتحال پر تعزیت کے لیے اکیلا چلا جاتا ہوں۔ راستے میں دوستوں اور موت کے فرشتے کو کوستا جا رہا ہوں۔ طرح طرح کے خیالات اور گمانوں میں گھرا، تعزیتی دفتر کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ سوچتا ہوں، جاتے ہی مولانا کے بڑے بیٹے سے بغل گیر ہو کر با آواز بلند رونا شروع کر دوں گا۔ مگر معاً خیال آتا ہے کہ مولوی نقب الدین اور ان کے بڑے بیٹے کے تعلقات آخری دنوں میں کچھ کشیدہ ہو گئے تھے۔ اس خیال کو فاسد سمجھ کر توبہ کر لیتا ہوں اور پھر شکر کرتا ہوں کہ جگ ہنسائی سے بچ گیا۔

تعزیتی دفتر پہنچتا ہوں تو اوسان خطا ہو جاتے ہیں کہ تعزیتی دفتر پر موجود مولانا قسم کے لوگ تو عربی یا عبرانی قسم کی زبان میں تعزیت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ الٰہی! اب کیا ہوگا؟ میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ سوچے ہوئے جملے اور تعزیت کا سارا پروگرام تہس نہس ہوتا دکھائی دیتا ہے تو قرآن مجید کی کوئی سورت یاد کرتا ہوں۔ باہزار دقت کچھ یاد نہیں آتا۔ میری ہیئت کذائی اور پریشانی دیکھ کر بعض ناہنجار میری طرف دیکھ کر مسکرانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بعضوں کو گمان گزرتا ہے کہ میں کوئی بھکاری ہوں جو غلطی سے بے موقع یہاں چلا آیا ہوں۔ ہر طرح کی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ دل میں خیال آتا ہے ایسے ناسمجھ اور قدر ناشناس لوگوں سے تعزیت ہی نہیں کرنی چاہیے۔ میری خودی اور حمیّت بیدار ہو جاتی ہے۔ تعزیتی دفتر سے تیزی کے ساتھ نکل جاتا ہوں۔ میرے کانوں تک کچھ واہیات لوگوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں، پیٹھ پیچھے تو بادشاہوں کی بھی برائی ہوتی ہے۔ مگر یہ۔۔۔۔ یہ کیا، اہل تعزیت کا ایک نامعقول طبقہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں اپنی رفتار کو رفتارِ زمانہ کے موافق کر لیتا ہوں۔ نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ ہجومِ نامہرباں مجھ سے کافی پیچھے رہ گیا ہے۔ گھر پہنچتے ہی بوسیدہ لباس اُتار کر پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ داڑھی مونچھیں صاف کر کے انگریزی لباس زیب تن کرتا ہوں۔ چوک بازار جا کر آزادانہ سیٹیاں بجاتا ہوں، بازار کی رونقوں کا نظارہ کرتا ہوں، بے فکر ہو کر شام کو گھر لوٹتا ہوں؛ تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے گھر کے باہر ایک ہجومِ ناسپاساں ہے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اظہار افسوس کرنے والوں کا ہجوم ہے جو مجھ پر مولوی نقب الدین کی موت کے صدمے کے اثرات کی کہانی بیان کرتے پھرتے ہیں۔ دو چار دن اس ناگہانی مصیبت پر خاموش رہتا ہوں، مگر صورتحال کو بے قابو ہوتا دیکھ کر گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ لق و دق صحرا میں ماہ و سال گزارنے کا مصمم ارادہ کر لیتا ہوں، مگر بے سود۔ کہ اب عمل اور ارادے میں آزاد نہیں رہا۔ آخر گھر کے باہر ایک بورڈ آویزاں کرا دیتا ہوں کہ مولوی نقب الدین سے میرا کسی طرح کا کوئی تعلق نہ تھا۔ مجھے اس کی موت سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں لوگوں کا تانتا بندھ جاتا ہے کہ ناحق ہم نے ایک مردِ قلندر کو آزار دیا۔

دیکھا آپ نے کہ ایک آدھ موت اور میت کن حالوں میں پہنچا دیتے ہیں۔ جب ہر طرف موت کا راج ہو اور موت کا گہرا غبار سب کو نگل رہا ہو؛ دیکھتے ہی دیکھتے بندے موت کے منہ میں جا رہے ہوں؛ یہاں تک کہ موت نے انسانی قدروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ کوئی کتنا ہی تعزیتی اُمور کا ماہر کیوں نہ ہو، پوری انسانیت کو تو پرسا دے نہیں سکتا۔ معاشرتی اقدار اور روایات اجازت دیں تو روح پر بدن کی حکومت دیکھ کر ہر فرد، دوسرے سے تعزیت کرے۔